افسانے

آنکھ اور اندھیرا

عفراء بخاری

آنکھ اور اندھیرا

آنکھ اور اندھیرا

(افسانے)

عفراء بخاری

سانجھ

کتاب کا نام	:	آنکھ اور اندھیرا
مصنفہ	:	عفراء بخاری
سرِ ورق	:	سعید ابراہیم
سال اشاعت	:	جون 2009ء
تعداد	:	500
قیمت	:	220
پرنٹر	:	اعزاز الدین پریس، لاہور

ISBN:978-969-8957-50-6

دوسری منزل، مفتی بلڈنگ 17/31 ٹمپل روڈ، لاہور
فون 042-7355323 فیکس 042-7323950
ای میل: sanjhpk@yahoo.com

انتساب

اباجی، آں، وڈپن،
چھٹپن اور بی بی جان
کے نام

فہرست

اس کتاب میں

''آنکھ اور اندھیرا'' محترمہ عفراء بخاری کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ ہے۔ اس میں شامل پندرہ افسانے پہلی مرتبہ کتابی شکل میں پیش کیے جارہے ہیں۔ اس سے پیشتر اُن کے تین افسانوی مجموعے، ''فاصلے'' (1964)، ''نجات'' (1999) اور ''ریت میں پاؤں'' (2003) شائع ہوچکے ہیں۔

عفراء بخاری نے لکھنے کی ابتداء بچوں کے رسائل سے 1952ء میں کی۔ افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز 1959ء میں لیل ونہار سے کیا۔ علاوہ ازیں اُن کے مضامین ''استقلال''، ''تعمیرِ نو، راولپنڈی'' اور روزنامہ ''امروز'' میں بھی شائع ہوتے رہے۔ 1979ء تک انہوں نے تسلسل سے لکھا اور اُن کے افسانے ''ادبِ لطیف''، ''داستان گو''، ''سویرا''، ''افکار''، ''ماہِ نو کراچی''، ''نقوش''، ''فنون''، ''سیپ''، ''الشجاع کراچی'' جیسے موقر ادبی جرائد کے ساتھ ساتھ دیگر معیاری پرچوں مثلاً ''سیارہ ڈائجسٹ، زیب النساء، تہذیب اور چلمن میں بھی شائع ہوتے رہے۔ 1993ء میں تقریباً پندرہ برس کے وقفے کے بعد انہوں نے افسانہ نگاری کا دوبارہ آغاز کیا اور یوں عفراء بخاری کی افسانہ نگاری کا پہلا دور 1959ء سے 1979ء اور دوسرا دور 1993ء سے زمانہ حال تک محیط ہے۔

''فاصلے'' میں شامل تقریباً سبھی افسانے مطبوعہ تھے۔ ''نجات'' کے سترہ افسانوں میں سے پندرہ پہلے دور میں لکھے گئے جبکہ دو افسانے (میاں پترو اور کندھے کا بوجھ) دوسرے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ''ریت میں پاؤں'' میں شامل بارہ افسانوں میں سے دس افسانے 1964ء سے 1968ء کے درمیان تخلیق کیے گئے جبکہ دو افسانے ''ریت میں پاؤں'' اور

''لکڑیوں کا گٹھا'' بالترتیب 1997ء اور 1999ء میں شائع ہوئے۔ اسی طرح زیرِ نظر مجموعے میں بھی آٹھ افسانے پہلے دور سے لیے گئے اور سات افسانے دوسرے دور کی تخلیق ہیں۔ ان افسانوں کی زمانی ترتیب کچھ یوں ہے:۔

آخری بیان (سویرا، شمارہ 79، ستمبر/ اکتوبر 2004)، ہدف (سویرا، شمارہ 77، مئی/ جون 2004)، دلِ نادان (سویرا، شمارہ 72، جولائی/ اگست 2003)، کمبل کا سوراخ (علامت، لاہور، جنوری 2001)، چھینٹ کا لحاف (علامت، لاہور، اکتوبر 1999)، زندہ درگور (ماہِ نو، لاہور، مئی 1998)، اندھیرے کا سفر (سویرا، شمارہ 66، گولڈن جوبلی نمبر 1997) بے قابو (ادب لطیف، اکتوبر 1997)، پتھر کے چہرے (چلمن لاہور، مئی 1974)، اپنا سامنہ (سویرا، شمارہ 42، 1969)، گھر کا مالک (ادب لطیف، جلد 68، شمارہ 4،3 1969) آنکھ اور اندھیرا (نقوش لاہور، 1968)، پناہ گاہ (ماہِ نو کراچی، اکتوبر 1968)، گھن (ماہِ نو کراچی، مئی 1967)، پچھتاوا (زیب النساء لاہور، جولائی 1966)

''آنکھ اور اندھیرا'' کے بعد عفراء بخاری کے افسانوں کا پانچواں مجموعہ ''سنگِ سیاہ'' زیرِ طبع ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ناول ''پہچان'' پر بھی کام کر رہی ہیں۔

ادارہ

پیش لفظ

ریاض احمد

طریقہ راسخہ تو یہی ہے کہ جب محترمہ عفراء بخاری کے پائے کی شخصیت کا مذکور ہو تو ابتداء یہاں سے کی جائے کہ موصوفہ کسی تعارف کی محتاج نہیں لیکن میں یوں نہیں کہوں گا۔ افسانہ نگاروں (صرف خواتین افسانہ نگار ہی نہیں) میں ان کی انفرادیت اپنی شناخت کروا چکی ہے۔ تاہم اس انفرادیت نے ان کے فن اور موضوع دونوں میں تنوّع کے امکانات پر قدغن نہیں لگائی۔ میرے نزدیک وہ اپنی فنی فتوحات کے باوصف اب بھی تعارف کی محتاج ہیں۔ میں اس کا سبب بھی بیان کیے دیتا ہوں۔ جب ان کی کتاب ''نجات'' شائع ہوئی تو اس کتاب کے تعارف کے طور پر میرا ایک مختصر مضمون حلقۂ اربابِ ذوق (لاہور) کی ایک نشست میں پڑھا گیا۔ بعض سامعین کو اصرار تھا کہ مضمون کسی اور طرح سے لکھا جانا چاہئے تھا لیکن صدرِ جلسہ جناب ڈاکٹر سلیم اختر نے کہا کہ اس مضمون کو سننے کے بعد اب وہ اگر ان افسانوں کو دوبارہ پڑھیں تو ''اور طرح سے پڑھیں گے۔'' مجھے احساس ہے کہ اس تذکرے میں خودستائی کی جہت بھی نکلتی ہے لیکن اس سے قطع نظر یہاں اس اَمر کا احساس دلانا مقصود ہے کہ موصوفہ کے افسانوں کی تمام تر یا کم از کم بعض معنوی پرتیں ایسی بھی ہیں جو ابھی تک بالعموم قارئین کی دریافت میں نہیں آئیں۔ یعنی یہ کہہ دینا کہ خاتون ہونے کے ناتے انہوں نے خواتین کے مسائل سے اپنے افسانوں کا تار و پود اَخذ کیا ہے اگرچہ اپنی جگہ درست ہے لیکن یہ ان کا ''کُل'' سرمایہ نہیں ہے۔ ایک تو اس لیے کہ خواتین کے مسائل مردوں کے روّیوں سے متعین ہوتے ہیں (تمامتر نہ سہی اکثر و بیشتر) اور یوں مردوں کی ذہنیت کا مطالعہ بھی ان کے ہاں

(بالواسطہ ہی سہی) بھرپور انداز میں موجود ہے اور اسی حقیقت پسندانہ معروضیت کے ساتھ جو نسوانی کرداروں کے ذکر میں ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اس ضمن میں اہم تر بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں کے کردار کسی فنی تجزیاتی یا نفسیاتی فارمولے یا سانچے میں ڈھال کر تخلیق نہیں کیے۔ یہ تو صرف مختلف اجزاء کی باہم چولیں بٹھانے والی بات ہوتی۔ کردار جیسے وہ ان کے افسانوں میں نظر آتے ہیں وہ تو پہلے سے موجود تھے۔ ان کا فن ایک تیشہ ہے جس کی ضرب نے ان کرداروں پر پڑے ''حجاباتِ سنگ'' کو دور کیا ہے تا آنکہ وہ اپنی پوری معنوی رعنائی کے ساتھ ہمارے سامنے آن کھڑے ہوتے ہیں۔

علامتیت کرداروں پر چھائے ہوئے حجابات کو تاریک تر کردیتی ہے۔ نفسیاتی افسانہ نگار سہل انگاری کے باعث مریضوں کے کوائف (Case Histories) سے بنے بنائے کردار اَخذ کر لیتے ہیں۔ پیشِ نظر پندرہ افسانوں میں علامتی طرز کا افسانہ صرف ایک ہے ''زندہ درگور''۔ اپنی کند ذہنی کے باعث میں اُس کے متعلق کچھ عرض کرنے سے معذرت چاہوں گا۔ نفسیاتی تجزیہ اُن کے افسانوں کو سمجھنے میں مدد ضرور کرتا ہے لیکن ان کے کردار Type نہیں ہیں نہ افسانے فارمولا افسانے۔ اس قسم کے افسانوں میں نفسیاتی پیچیدگی کا تعین پہلے سے کر لیا جاتا ہے۔ افسانہ نگار اپنی علمیت جتانے کے لیے یا اس خدشے کے پیشِ نظر کہ کہیں قارئین ان افسانوں کے کرداروں کے روّیے کی نفسیاتی وجوہ کو سمجھنے سے قاصر نہ رہ جائیں اور یوں اس کی نفسیات دانی کی داد نہ دے سکیں، افسانے میں کہیں نہ کہیں ان اصولوں کا حوالہ لے آتا ہے۔ ویسے بھی کرداروں کو آزادی کے ساتھ اپنی تعمیر کرنے کی مہلت نہیں دی جاتی بلکہ موڑ توڑ کر انہیں تخریب کی راہ پر ڈال دیا جاتا ہے۔ دراصل یہ فریب کاری خود تحلیلی نفسیات دانوں کی عطا کردہ ہے۔ جیسے علامہ اقبال نے نشاندہی کی تھی کہ مریضانہ ذہنوں کے تجزیے سے جو اصول مرتب کئے گئے ہیں، صحتمند اشخاص کی ذہنیت کو انہی کے پیمانے سے ماپنے کی سعی کی جاتی ہے۔

ان پندرہ افسانوں میں عفراء بخاری نے کسی جگہ بھول کر بھی کسی نفسیاتی اصول کا نام نہیں لیا۔ وہ اپنے کسی کردار کے اعمال کی نفسیاتی توجیہہ بیان نہیں کرتیں۔ ان کے کردار کسی داخلی جبر سے تربیت نہیں پاتے۔ وہ تو صرف خارجی واقعات میں اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں واقعات وہ لمحاتی تجلی ہیں جن میں افسانہ نگار نے اپنے کرداروں کو دیکھا اور پھر انہی واقعات کے بیان سے ان کو قارئین کے لیے متحیّر کر دیا۔ جب مختصر افسانے کا رواج ہوا تو ناول کے مقابلے اس صنف میں انکشاف کے ایجاز کو ایک مثال سے واضح کیا جاتا تھا کہ ایک اجنبی تاریک رات میں ایک اَن دیکھے میدان کے کنارے کھڑا ہے اچانک بجلی کا کوندا لپکتا ہے تو اجنبی کو صرف اتنی مہلت ملتی ہے کہ وہ میدان کے ایک گوشے میں بکھری ہوئی موجودات پر ایک نظر ڈال سکے۔ اس لمحاتی تجلی میں جو کچھ اُسے نظر آتا ہے وہی گویا اس میدان کی کل کائنات ہوتی ہے... بعض اوقات بالکل معمولی، بعض اوقات یکسر انوکھی۔ یوں سمجھیے کہ کچھ لوگ فوٹو کھنچوانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ ان لوگوں کی تیاری میں ایک گونہ تصنع در آتا ہے لیکن جب کیمرہ کلک کرتا ہے تو کوئی انجان شخص اپنے معمولات میں مصروف اُس کی زد میں آجاتا ہے یا اُنہی منتظر لوگوں میں سے کسی سے عین اسی لمحے کوئی غیر معمولی حرکت سرزد ہو جاتی ہے۔ تو یوں Snapshot میں کیمرے کی نقالی میں بھی ایک تخلیقی اپج جھلکنے لگتی ہے۔ خاموش غیر متحرک مناظرِ قدرت میں بھی بعض اوقات روشنی کے کسی خاص زاویے کے باعث ایک غیر معمولی کیفیت نظر آتی ہے۔ دنیا اپنے معمول کی ڈگر پر رواں دواں ہے لیکن اس معمول کے دوران بعض اوقات کچھ ایسی صورتیں نمو پذیر ہو جاتی ہیں جن میں دیکھنے والے ایک نیا جہانِ معنی دریافت کر لیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کائنات اعیان ثابتہ کا عکس ہے لیکن کچھ عیون ابھی خارج میں اپنے ظہور کے منتظر ہیں۔ فنکار ان عیون کو اپنے فن میں منعکس کر لیتا ہے تو فن دوسرے درجے کی نقالی کے بجائے تخلیق بن جاتا ہے اور افسانے کا کردار Type کے بجائے تخلیقی انفرادیت کا مظہر۔

پیشِ نظر پندرہ افسانوں میں سے تیرہ افسانے کردار کے افسانے ہیں لیکن عفراء بخاری تو صرف واقعات بیان کرتی ہیں۔ کہانی کا رخ کردار متعین نہیں کرتے۔ اس کے برعکس شاید یوں کہنا زیادہ برمحل ہوگا کہ کہانی میں واقعات کی کٹھالی میں ڈھل کر ہی کردار تشکیل پاتا ہے۔ واقعات، اشیاء اور کرداریوں باہم پیوست ہیں کہ ان کو الگ الگ خانوں میں بانٹنا مشکل ہوتا ہے۔ واقعات یا اشیاء، کردار کی علامت بن کر اس کے خدوخال کا نقش اُبھارتے ہیں۔ چھینٹ کا لحاف تو پھر ایک نام ہے لیکن اس کے گودڑوں میں گٹھڑی بنی ہوئی بڑھیا کا تو کوئی نام ہی

نہیں۔ 'آنکھ اور اندھیرا'، 'گھن' اور 'پتھر کے چہرے' میں بند کھڑکی، ایک پلنگ، ایک ریک، پتھر کا ایک چہرہ، چائے کے برتنوں سے بھری ٹرے (Tray)، امتحانی پرچوں کا ڈھیر، یہ سب چیزیں مل کر تین نسوانی کرداروں کی گھٹن کو ظاہر کرتی ہیں۔ گھر کا مالک کون ہے؟ بوڑھا باپ یا پرانا ہینڈ پمپ؟ بوڑھے کے وجود کی تو اولاد تقریباً ناکارہ سمجھ کر نفی کر چکی ہے لیکن پمپ کا وارث تو پھر بھی موجود ہے۔ ہدف کے Sweeper کا نام بھی ہم نہیں جانتے تاہم اس کا ہدف جو ایک کتیا ہے ایک نام بھی رکھتی ہے ''چنی''۔ دل ناداں میں پندرہ فٹ اونچی بائیسکل کے سامنے ماں، بیٹی اور بیٹا تقریباً غیر اہم ہو جاتے ہیں۔ اصل میں یہ سائیکل کہانی کے رُخ یا معنویت کو متعین کرتی ہے۔ پچھتاوا میں غیر حاضر کردار خالی گھر کو آباد رکھتا ہے۔ اس کا آسیب صرف ویران گھر پر ہی سایہ فگن نہیں ہے بلکہ بہن پر بھی ہے۔

ان افسانوں کے واقعات میں کوئی اُلجھاؤ نہیں، کوئی پیچ وخم نہیں۔ معمول کے واقعات ہیں۔ انہی واقعات کے تار و پود میں کرداروں کے نقش اُبھرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کردار بہت سیدھے سادے ہیں (سپاٹ نہیں، ٹائپ بھی نہیں) تاہم ان کی ظاہری سادگی کی تہہ میں ایک جہانِ معنی آباد ہے جو واقعات کے پردے میں آہستہ آہستہ اوپر کی سطح تک پہنچ کر اپنا آپ ظاہر کرتا ہے۔ واقعہ خارج میں تشکیل پاتا ہے۔ اس کی واقعاتی تہوں میں علامتی (Symbolic) اشارے بھی جھلک دکھاتے رہتے ہیں، تاہم جب یہ واقعات اپنے اختتام کے نزدیک پہنچتے ہیں تو فلیش بیک (Flash Back) کے طور پر اپنے پَرتو سے ابتدائی واقعات کو ایک نیا رنگ روپ عطا کر دیتے ہیں۔

کچھ کردار البتہ پیچیدہ بھی ہیں۔ ان کی گرہیں واقعات میں پوری طرح نہیں کھلتیں۔ ان کے لیے تھوڑی سی سراغرسانی کرنی پڑتی ہے۔ پیچیدہ کردار بعض اوقات گھناؤنے واقعات میں اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں جس سے اخلاقی اور جمالیاتی حِس مجروح ہوتی ہے لیکن عفراء بخاری نظیری کے بتائے ہوئے گُر سے کام لیتے ہوئے ان مقامات سے دامن آلودہ کئے بغیر گذر جاتی ہیں۔

نیست در خشک و تر بیشہِ من کوتاہی   چوب ہر نخلے کہ منبر نہ شود دار کنم

دار پر لٹکے ہوئے کردار ان افسانوں میں بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ ''ہدف'' کے

Sweeper ہی کو لے لیجیے۔ اس عرفی نام کے علاوہ اسے کوئی نام تک نصیب نہیں ہوا۔ نفرت، حقارت، تذلیل، نظر انداز کیے جانا ہی اس کی زندگی کی کل بساط یا اثاثہ ہے۔ صفائی ستھرائی اس کی ذمہ داری ہے اور لعن طعن اس کا نصیبہ۔ تاہم دو فن وہ اور بھی جانتا ہے۔ ایک آوارہ کتوں کو تلف کرنا، دوسرے دفتر میں پیدا ہونے والے چوہوں کو مارنا۔ وہ خود محسوس کرتا ہے کہ جب وہ کتا مار مہم پر نکلتا ہے تو کوئی اور ہی چیز بن جاتا ہے... ظالم سفاک۔ دفتر میں پیدا ہونے والے چوہوں کو اپنی نوکیلی سلاخ سے زخمی کر کے سسک سسک کر مرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ ان کی مذبوحی حرکات کو دیکھتا ہے تو اور بھی غضبناک ہو جاتا ہے۔ انہیں گندی گندی گالیاں دیتا ہے۔ دفتر کے بابوؤں کی جلی کٹی سنتے ہوئے وہ پلٹ کر انہیں کوئی جواب نہیں دیتا البتہ کبھی کبھی جب ایسے موقعوں پر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے تو وہ بوکھلا جاتے ہیں۔ یہ بوکھلاہٹ اس فقرے کے کھوکھلے رعب میں ظاہر ہوتی ہے، ''نیچے کر اپنی آنکھیں''۔ گویا انہیں انتقامی جذبے کی ہیبت اس کی گھناؤنی زرد آنکھوں میں جھلکتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس کے ہاتھوں کتے اور چوہوں کی تذلیل اور ذلت آمیز موت انہیں اپنے سروں پر منڈلاتی محسوس ہونے لگتی ہے۔ ملازمت سے فارغ کیے جانے کے بعد بھی اسے اپنی بہو کے ہاتھوں اسی طرح کے توہین آمیز اور نظر انداز کیے جانے والے سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی بہو جثے بشرے اور اپنی عادات کے اعتبار سے نہایت قابلِ نفرت عورت ہے۔ اُسے گھر کی دیکھ بھال کام کاج میں کوئی دلچسپی نہیں۔ ایک کھڑکی میں بیٹھی سارا دن بے ہنگم سروں میں فراقیہ گانے گاتی رہتی ہے۔ شام کو اس کا خاوند جو ہسپتال میں ملازم ہے مریضوں کا بچا کھچا کھانا لے آتا ہے اور وہ کھانے کے بعد خاوند سے دھینگا مشتی کرنے لگتی ہے۔ اس موٹی بھدی عورت کے مقابلے میں اس کا دبلا پتلا بیٹا بے حقیقت نظر آتا ہے۔ اس مار کٹائی کے بعد وہ اسے کھانا دینا اکثر بھول جاتی ہے اور اسے اتنی ہمت نہیں پڑتی کہ اس سے کھانا مانگ لے۔ ان حالات میں وہ گندگی کے ڈھیروں کو کریدتا پھرتا ہے کہ بیچنے کے قابل کوئی چیز ہاتھ آ جائے تو اپنے کھانے کے لیے دو لقموں کا اہتمام کر سکے۔ اسی اثناء وہ ایک آوارہ کتیا اور اس کے پہلے جھول کے بچے ڈھونڈ نکالتا ہے۔ اس نے کتیا کو چٹی کا نام دیا حالانکہ وہ سفید نہ تھی۔ اس کا نوجوان سُبک جسم اور سب سے بڑھ کر اس کا ''صاحب اولاد'' ہونا اس کے لیے بہت پرکشش

ہے۔ پہلے تو چٹی اس سے بدکتی ہے لیکن پھر وہ اس سے مانوس ہو جاتی ہے۔ وہ اس کے لیے ہر روز چھیچھڑے لاتا ہے اور اس کے بچوں کو گود میں لے کر دل بہلاتا ہے۔ چٹی دراصل نوجوان بہو کا وہ Image ہے جو اسے اپنی حقیقی بہو میں نہیں مل سکا۔ چٹی اور اس کے پلے گویا اس کی تمناؤں کا خارجی روپ ہیں لیکن ان کی موجودگی اپنی حقیقی بہو کے خلاف اس کے جذباتِ کدورت کا مداوا نہ کر سکی۔ ایک دفعہ پھر جب اسے کتا مار مہم میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے تو پہلے تو وہ انکار کر دیتا ہے کہ اب اس میں پہلا سا دم خم نہیں۔ کوئی پلا ہوا کتا پلٹ کر حملہ کر دے تو اس کی تکا بوٹی کر ڈالے تاہم وہ یہ کام کر گذرتا ہے اور اس کا ہدف چٹی بنتی ہے۔ پہلے انکار اور بعد میں رضامندی میں اس کی بہو کے Image کو واضح طور پر دخل ہے۔ پلٹ کر حملہ کرنے والا پلا ہوا کتا اس کی بہو کا لاشعوری Image ہے۔ چٹی اور بہو گڈمڈ ہو جاتی ہیں ۔ایک موقعہ پر چٹی جب اس پر بھونکتی ہے تو وہ اسے ڈانٹتا ہے ''جا چلی جا تو نہیں جانتی میں کون ہوں''۔ کاش یہ جملہ کبھی وہ اپنی بہو سے کہہ سکتا۔ اس کا لاشعور بہو کا انتقام چٹی سے لینے کا فیصلہ کر لیتا ہے اور آخر کار بڑی تگ و دو کے بعد وہ اسے بڑے دردناک طریقے سے مار دیتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ تو اُس نے سو روپے کے لیے کیا تھا لیکن چٹی کو مارنے کے بعد وہ اپنا انعام یا معاوضہ لینے اپنے پرانے دفتر نہیں جاتا۔ اس کا جذبہ انتقام مطمئن ہو چکا تھا۔ یہی اُس کا مقصود تھا۔

اس سے بھی زیادہ پیچیدہ کردار ''آخری بیان'' کی نوجوان پاگل لڑکی گل پری ہے۔ وہ ایک لاوارث چھ سالہ بچی تھی جسے صمد خاں کی بیوی (خالہ) نے پالا پوسا اور پھر اسی کے قبیلے کے ایک نوجوان سے اس کی شادی کر دی لیکن شادی کے ایک ماہ بعد ہی اسے مالیخولیا کے دورے پڑنے لگے۔ اس کا خاوند ان حالات میں چپکے سے غائب ہو جاتا ہے۔ اس نوجوان کے خدوخال اور بیاہتا زندگی میں اس کا روّیہ افسانے میں ظاہر نہیں ہوتے۔ جس طرح وہ پردہ غیب سے ظہور پذیر ہوا تھا اسی طرح پھر معدوم ہو جاتا ہے۔ شادی کے بعد گل پری پر ایک ہی ماہ کے اندر دورے پڑنے میں اس نوجوان کا کردار صرف قرائن ہی سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ صمد خان ایک جابر اور مغلوب الغضب آدمی ہے۔ گُل پری صمد خاں اور خالہ کی تثلیث میں صمد خاں کو پدری حیثیت سے ہی جانا جا سکتا ہے۔ نفسیات دان ہمیں بتاتے

ہیں کہ اس طرح کے جابر والد کی بیٹیاں اپنے سے بڑی عمر کے ذرا دبنگ قسم کے مرد سے شادی کرتی ہیں۔ یعنی ان کے ذہن میں خاوند کا تصور ان کے والد کی شخصیت کا پرتو ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے گل پری کے لیے ایسے خاوند کو قبول کرنا ممکن نہیں تھا جو صمد خان کے مقابلے میں اپنا مقام استوار نہ کر سکے۔ اس طرح ان کے مابین ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی کا پیدا ہونا ممکن نہ تھا (خصوصاً صمد خاں کی موجودگی میں) جس نے گل پری کو ہسٹیریا میں مبتلا کر دیا۔ اس کی مریضانہ ایذا پسندی کا باعث بھی یہی ہے۔ اس خیال کو اس امر سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ پاگل پن کے دوران گل پری کو آسودگی صرف صمد خاں سے پٹنے پر ہی نصیب ہوتی ہے۔ دس چھڑیاں کھائے بغیر نہانے پر تیار نہیں ہوتی۔ جلتی ہوئی لکڑی کے زخم کا اندمال قبول نہیں کرتی۔ خالہ جب مرہم پٹی کی کوشش کرتی ہے تو اس سے اُلجھ پڑتی ہے۔ ایک آدھ جملہ خالہ کی زبان سے بھی ایسا نکل گیا ہے جس سے خالہ کے متعلق گل پری کے ''رقیبانہ'' جذبات پر روشنی کی کرن پڑتی ہے، ''میں نے اسے پالا پوسا اس کی شادی کی لیکن مجھ سے 'سوکنوں' کی طرح لڑتی ہے''۔ بیٹی ماں کی رقیب بن جاتی ہے۔ سب سے بڑا ثبوت اس کا آخری (نزعی) بیان ہے۔ جس میں وہ صمد خاں کو اپنا قاتل ماننے سے انکار کرتی ہے۔ سکرات موت میں اس کی بڑبڑاہٹ سے غیاث نے یہ معنی اخذ کیے ہیں کہ وہ اپنے قتل کا ملزم خالہ کو ٹھہراتی ہے۔ (غیاث یہ فقرہ نہ بھی کہتا، تو اس بڑبڑاہٹ کو سن کر اس کی خلافِ معمول پریشانی بھی اسی طرف رہنمائی کرتی) تاہم عفراء بخاری اس طرح کی کسی تجزیاتی دلیل کو افسانے کی بنت میں شامل نہیں کرتیں۔ کوئی جلد باز افسانہ نگار ہوتا تو وہ افسانے کی معنویت یا رمزیت کو گہرا کرنے کے لیے ضرور اس کا سہارا لیتا۔ وہ صرف واقعات بیان کرتی ہیں۔ وہ گل پری کے روّیے کا براہِ راست تذکرہ بھی نہیں کرتیں صرف صمد خاں کے ستم کے واقعات کو بیان کرتی چلی جاتی ہیں جو بالآخر گل پری کو موت کے منہ میں دھکیل دیتے ہیں۔ گل پری کی موت کے بعد بھی اس کے لیے خالہ کی (مادرانہ) شفقت باقی رہتی ہے کہ اپنے آخری دو لفظوں ''نہیں نہیں'' سے ان کی عزت اور سہاگ بچا گئی۔ اس افسانے کی پوری صورت حال (Situation) بہت نازک ہے۔ افسانہ نگار کا اس سے عہدہ برا ہونا اِک آزمائش سے کم نہ تھا۔ ذرا سی لا پرواہی یا اپنی ژرف نگاہی کی داد پانے کے لیے ایک آدھ تشریحی جملہ کئے کرائے پر پانی پھیر دیتا۔ مصنفہ نے

قاری کی ذہانت پر اعتماد کر کے اپنی فنی ذمہ داری اور اعتماد کی لاج رکھ لی ہے۔

دوسرے کردار جو بظاہر پیچیدہ نظر نہیں آتے وہ بھی اتنے سادہ نہیں جتنے نظر آتے ہیں۔ مثلاً آپ ''بے قابو'' کو ہی لے لیجئے۔ایک بے حس اور غیر ذمہ دار شخص ہے۔ مصنفہ نے اس شخص کو براہِ راست پیش نہیں کیا۔ ایک خوفناک خواب میں اس کے خدوخال اُبھرتے ہیں۔ اس خوفناک خواب کے ظاہری اسباب بیان کر دیئے گئے ہیں۔ قاری مطمئن ہو جاتا ہے کہ چلو معمہ حل ہوا۔ خواب کے آخر میں اسے ایک تشویشناک پیغام موصول ہوتا ہے۔ اسے فوراً کسی جگہ پہنچنے کے لیے کہا گیا ہے۔ وہ جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتا ہے لیکن پنجابی محاورے ''من حرامی، حجتاں ڈھیر'' کے مصداق ڈھیل سے کام لیتا ہے۔ کبھی شیو، کبھی کپڑے بدلنے، کبھی باتھ روم کی ٹونٹی کی مرمت، کبھی لان کی گھاس کی صفائی۔ یہ ٹال مٹول ایک طرف غیر ذمہ داری کو ظاہر کرتی ہے تو دوسری طرف Escapist ہتھکنڈوں کو۔ کبوتر کی طرح بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرنے کی کیفیت بھی نظر آتی ہے۔ آخر میں اُسے ایک سیڑھی نظر آتی ہے۔ اس سیڑھی پر چڑھنے میں اسے بہت دِقت محسوس ہوتی ہے۔ اسی اثناء میں بیوی بچے یاد آ جاتے ہیں تو اس پر رِقت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ آخری سیڑھی تک بڑھتا جاتا ہے لیکن جنگلے تک پہنچ نہیں پاتا۔ یہاں اس کی ذہنی کیفیت خواب کے ابتدائی مناظر کی طرف رجعت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ابتدا میں رکاوٹ ایک مضبوط رسی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے آخر میں سیڑھی جنگلے کے پاس سے گذر جاتی ہے۔ نارسائی دونوں جگہ موجود ہے یعنی خوف اور اندیشے جو اس خواب کا باعث تھے۔ ان کا حل نہیں سُوجھتا۔ سیڑھی اُس کی بیوی نے تعمیر کروائی ہے۔ اس کا جنگلے تک نہ پہنچ سکنا، اس پر چڑھتے وقت ہر قدم منوں بوجھل ہو جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی راہ کی اصل رکاوٹ اس کے بیوی بچے ہیں۔ بیزاری سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کو وہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں... ''اچانک اسے اپنے بیوی بچوں کا خیال شدت سے آیا۔ اس وقت وہ کہاں ہوں گے؟ کیا کر رہے ہوں گے؟ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ اس وقت اس حال میں سیڑھی پر کھڑا ہوگا۔ ان کے لیے تو یہ بات بہت غیر معمولی اور انوکھی ہوگی بلکہ شاید مضحکہ خیز بھی۔ وہ اپنے اُوپر ہنسنے لگا۔ یہ بڑی دکھی ہنسی تھی کیونکہ ہنسنے میں اس کے آنسو نکل پڑے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ اس کا دل بھر آیا۔ وہ چاہتا تھا وہیں بیٹھ جائے اور اپنے

دل کی خوب بھڑاس نکالے... پھر اس نے سوچا تھوڑا سا آخری کام باقی ہے۔ ابھی چند منٹ بعد وہ فارغ ہو جائے گا۔ پھر اطمینان سے گھر سے نکل جائے گا...... ''دراصل یہ سب کچھ ''خودفریبی'' ہی کا حصہ ہے۔ پیغام دبی ہوئی لاشعوری خواہش ہے۔ یعنی بیوی بچوں کی موت کی خواہش (نفسیات میں اس کجروی کی نشاندہی کی جا چکی ہے۔) یہ ٹال مٹول اسی خواہش کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہے کہ کہیں اس کی بروقت مداخلت سے تشویشناک پیغام اپنے قدرتی منطقی انجام کو پہنچنے سے رہ نہ جائے۔ اس میں بزدلی بھی شامل ہے کہ زبوں صورتِ حال کا سامنا کرنے سے کتراتا ہے۔ اس حال میں اپنی کوتاہی کا احساس اور بیوی کی خدمت گذاری پر احساسِ ہمدردی یا احساسِ ندامت کفارے کی ڈھال ہے۔ اس افسانے میں تفصیلات کی بھرمار ہے لیکن کسی نامعلوم فنی ہنرمندی سے مصنفہ نے انہیں بیزار کن (Boring) نہیں بننے دیا۔ یہی اسلوب ''اندھیرے کے سفر'' میں بھی نظر آتا ہے۔ یہاں تو پھر معلوم حقائق ہیں۔ وہاں تو رحم مادر میں جنین کی حرکات کا ذکر ہے لیکن بیزار کن وہ بھی نہیں ہو پایا۔

بحیثیت مجموعی مردانہ کردار، خودغرض، لالچی، بے حس اور معاف کیجئے کسی حد تک کمینہ واقع ہوئے ہیں۔ 'چھینٹ کا لحاف' میں خاوند پانچوں شرعی عیوب سے داغدار ہے۔ ساتھ ہی اس حد تک لالچی ہے کہ بیوی کے حق مہر کے ڈھائی ہزار روپے ہتھیانے کے بعد بھی الٹا نان و نفقہ کا احسان جتاتا ہے۔ 'اپنا سامنہ' میں خاوند اتنا لالچی ہے کہ اسے صرف بیوی کی تنخواہ سے غرض ہے۔ 'دلِ ناداں' کا مردانہ کردار البتہ ایک سادہ لوح نوجوان ہے۔ یہاں مصنفہ کی حسِ مزاح نے اس بھولے بھالے کردار سے پندرہ فٹ اونچے بائیسکل کی صورت میں گویا مذاق کیا ہے۔ اس میں مزاح Black humour کی حد سے ذرا ادھر ہی رک جاتا ہے کہ سادہ لوح نوجوان اس بائیسکل کی سواری میں کسی جانکاہ حادثہ کا شکار نہیں ہوا، تاہم یہ عجیب وغریب ڈھانچہ ماں اور بہن کی تمناؤں کا خون کر دیتا ہے۔ سادہ لوح مرد کی منصوبہ سازی کے اس مضحک روپ کی زد بھی بالآخر مجبور خواتین پر ہی پڑتی ہے۔ پندرہ فٹ اونچے بائیسکل کے لیے تو ''ہاتھی دروازے'' والی حویلی چاہیے تھی۔ چھوٹے سے مکان کی ڈیوڑھی میں اس کا کھڑا کیا جانا اس خاندان کی بے بسی پر طنز نہیں تو کیا ہے۔

خواتین کے کرداروں کا بنیادی نکتہ خودفریبی ہے۔ ان کی وفا، مامتا، شوہر پرستی سبھی اس

خود فریبی کا حصہ ہیں یا اس کی جزئیات۔ 'چھینٹ کا لحاف' میں باپ کے ڈر سے بھاگنے والا بیٹا (میراشیر) سب عزیزوں کو نرم و گرم کمبل تحفتہً بھیجتا ہے اور بوڑھی ماں کو چار موم کا دوپٹہ۔ آخر میں جو کمبل وہ بھیجتا ہے اس پر اس کی چھوٹی سی بیٹی کے جہیز کی مہر لگی ہے۔ لش لش کرتی ہوئی ریشمی رضائی کی خواہش کا جواب... چار موم کا دوپٹہ! اس طنز اور ستم ظریفی کا شکار ''پناہ گاہ'' کی پھوپھی کی خوش فہمی بھی ہے۔ وہ مطلقہ خاتون ہیں۔ خاوند دوسری بیوی کے ساتھ عیش منا رہا ہے لیکن انہیں یقین ہی نہیں آتا۔ اب جو کسر رہ گئی تھی وہ قدرت کے انتقام نے پوری کر دی ہے۔ 'اپنا سامنہ' میں خاندانی منصوبہ بندی کا پرچار کرنے والی نفیسہ کو اپنی بدنصیبی کا تب پتہ چلتا ہے جب وہ بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی ہوتی ہے۔ شادی کو انگریزی قانون میں Social Contract کہا جاتا ہے۔ افسانہ اس اصول پر بھی ایک بھرپور طنز ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کی زد میں آ کر یہ معاہدہ سراسر کھوکھلا رہ جاتا ہے۔

بچپن کی Obsession یا Fixation کا حسرت ناک انجام کمبل کا سوراخ میں نظر آتا ہے۔ لٹکی ہوئی آستینوں سے ناک صاف کرنے والا سرجو جب Disillusionment کے لمحے سے دوچار ہوتا ہے تو اپنے قارئین کو بے حاصلی کی افسردگی میں لے ڈوبتا ہے۔

''اُس میں رنگ برنگے، خوبصورت، چمکیلے کنچے جیسی کوئی بات نہ تھی... وہ ٹھٹھک گیا... سارے پھول اُس کے ہاتھ سے گر گئے۔ تب اُسے لگا جیسے دو سوراخوں والا پرانا کمبل، اچانک پھیل کر پورے کمرے پر محیط ہو گیا ہے اور وہ ایک گھناؤنے احساس کے ساتھ، ان سوراخوں میں دھنستا، کہیں کسی اور طرف جا پڑا ہے۔''

اس افسانے میں کئی چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں جو پہلی نظر میں تو اہم دکھائی نہیں دیتے لیکن در پردہ شعور کی نچلی سطح پر معنی خیز نکات بن کر افسانے کے تار و پود میں رنگ بھرتے ہیں۔ مثلاً دین محمد کو ہر خط میں یہ تاکید کہ اپنے بیٹے کو تعلیم ضرور دلائے۔ پہلی ملاقات میں لٹکتی ہوئی آستینوں اور بہتی ناک والا سرجو اس مشورے کے لیے موزوں نظر نہیں آتا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس کی اس حد تک کایا کلپ ہو جاتی ہے کہ باپ کی اس فہمائش پر کہ ''باجی کو سلام کرو'' وہ الٹرا ماڈرن انداز میں دو انگلیاں لہرا کر ''ہائے'' کہتا ہے۔ پھر ملازمت کے درمیان وہ تقریباً ایک سطح پر آ جاتے ہیں۔ اب ایک طرف میلِ خاطر اور احساسِ برتری کے

مقابل دوسری طرف ایک Inhilation یا احساسِ کمتری میں کشمکش جاری ہو جاتی ہے۔ سنبل، سرجو کو ''اپنی گاڑی'' میں گھر چھوڑنے تو چلی جاتی ہے تاہم اسے یہ بھی یاد دلاتی رہتی ہے کہ وہ ہے تو وہی ''پسر دین محمد''۔

جس لڑکی کو اس نے پہلے پہل اپنی ماں کے جہیز میں ملنے والے رنگین پایوں والے پلنگ پر بیٹھے دیکھا تھا، اس کا Image لاشعور میں دلھن کا روپ دھار لیتا ہے (ماں بمقابل دلھن)۔ آخر ایک طرف میلِ خاطر احساسِ برتری پر غالب آ جاتا ہے۔ لیکن کامیابی کے آخری لمحے میں دوسری جانب احساسِ کمتری شب خون مارتا ہے یا شاید فرائڈ۔ یوں کہیے کہ عروسی پلنگ پر نظر آنے والی صورت ماں کے Image سے گڈ مڈ ہو جاتی ہے اور سارا طلسم یکدم ٹوٹ جاتا ہے۔ پلٹ کر دیکھیے تو پہلی شادی کا تلخ تجربہ اور اس کے بعد دوسری شادی پر آمادگی اور وہ بھی پسر دین محمد سے اسی داخلی میلِ خاطر کا شاخسانہ ہے۔ احساسِ برتری کے زیرِ اثر پہلے خاوند کی اترن اور پرانے جہیز کی فرنیچر پر ''سرجو'' کو تو ٹرخایا جا سکتا ہے لیکن سراج دین کو اگر قبول کر لیا جاتا تو وہ یقیناً بہتر سلوک کا تقاضا کرتا۔

'پچھتاوا' میں بچوں کی باہمی رقابت بعد کی زندگی میں ایک خوفناک احساس بن کر فیروز لنگڑے کی بہن کی زندگی کو اجیرن بنائے رکھتی ہے۔ آخر وہ جرأت کر کے اس اُلجھن سے چھٹکارا پانے کے لیے جب ویران مکان میں داخل ہو جاتی ہے تو ایک کمرے میں اسے فیروز کی سانسوں کی آہٹ محسوس ہوتی ہے۔ وہ گھر کا دروازہ کھلا چھوڑ کر لوٹ جاتی ہے شاید اس لیے کہ فیروز کے آسیب کو ویران گھر سے نکلنے میں آسانی ہو۔ خود وہ یہاں سے دور بھاگنے کے لیے پردیس میں مقیم اپنے خاوند سے بار بار اسے اپنے پاس بلا لینے کا تقاضا کرتی ہے اور باپ کے اس منصوبے کی فوراً تائید کرتی ہے کہ مکان بیچ دیا جائے۔ بہر حال فیروز لنگڑے کی روح اس ویران گھر کو اسی طرح آباد رکھتی ہے جیسے والد اور بہن کے دل و دماغ کو۔

''آنکھ اور اندھیرا''، ''پتھر کے چہرے'' اور ''گھن'' کا موضوع ایک خاص معاشرتی مسئلہ ہے جو جدید معاشرے میں درمیانے طبقے سے مخصوص ہے۔ ''درمیانہ طبقہ'' میں نے کسی اصطلاحی معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ اس سے مراد وہ طبقہ ہے جو لارڈ میکالے کے فیض سے ایک خاص نوع کی تعلیم سے آراستہ ہے۔ گذر بسر پشتم پشتم ہو جاتی ہے تاہم فاقہ زدہ نہیں

ہیں۔ اونچے آدرش ان کی راہ میں رکاوٹیں پیدا نہیں کرتے البتہ کچھ روایات کی پابندی ان کے ہاں پائی جاتی ہے... تھوڑے تھوڑے قدیم تھوڑے تھوڑے جدید۔ دراصل ان کے ہاں کوئی مسئلہ ہے تو یہی قدیم اور جدید کے درمیان لٹکے رہنا ہے۔ ان کی بچیاں تعلیم حاصل کرتی ہیں چھوٹی چھوٹی ملازمتیں بھی کرتی ہیں لیکن برقعہ نہیں اُتار سکتیں، گھر کے دروازے کے باہر نہیں جھانک سکتیں، کھڑکیاں بند رکھنے پر مجبور ہیں۔ یہی کھڑکیاں 'آنکھ اور اندھیرا' اور 'پتھر کے چہرے' میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ ان تینوں افسانوں کا مشترک مسئلہ نوجوان بچیوں کی شادی ہے۔ اس معاملے میں رکاوٹ کی جو وجہ عموماً بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ مناسب رشتہ نہیں ملتا۔ دل کی تسلی کا سامان یوں کیا جاتا ہے کہ رشتے آسمانوں میں طے پاتے ہیں۔ لیکن ان افسانوں میں ایک اور عنصر کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ اسے محسوس کیا جاسکتا ہے لب پر نہیں لایا جاسکتا۔ والدین کے لاڈ پیار کی تہہ میں کہیں نہ کہیں ان کی Possessiveness بھی اس مسئلے کا سبب ہوتی ہے۔ اسے maniac نہ کہیئے کہ یوں ماں باپ کے خلوص کی توہین ہوتی ہے۔ چھوٹے کنبوں میں یہ کشمکش زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں کی روایت میں ماں باپ کی دہلیز کو چھوڑتے وقت بچیاں بہت دلگیر ہوتی ہیں لیکن والدین بھی جدائی کی کسک کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اصل مسئلہ اس سے پہلے در آتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار اور خصوصاً اگر وہ پہلی اولاد ہوں تو والدین کو ان کی ایسی باتوں سے بھی لاعلمی کے پردے میں درگذر کرنے پر مائل کر دیتا ہے جن پر گرفت ضروری ہوتی ہے۔ عموماً والد اس میں زیادہ لاپروائی سے کام لیتے ہیں۔ مائیں اپنی مامتا کے باوجود حقیقت پسندانہ رویہ اپنا لیتی ہیں۔ انہی حالات میں ''آنکھ اور اندھیرا'' کی بڑی بہن بھٹک جاتی ہے۔ والدین مجبور ہیں کہ محبت کو سینے میں دفن کر دیں اور اسے بھلانے کی کوشش کریں لیکن فتویٰ تو وہی چلتا ہے ''رفتید ولے نہ از دلِ ما''۔ چھوٹی بیٹی کو البتہ سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ کھڑکی کے در پاٹ دیئے جاتے ہیں۔ کمرے کے اندر بڑی بہن بہرطور پہلے کی طرح حاوی اور متصرف ہے۔ اس کی چیزیں جوں کی توں پڑی ہیں۔ یوں کمرے کی گھٹن اور بھی بڑھتی ہے لیکن چھوٹی بہن کو بڑی بہن کی حرکت کا خمیازہ بھگتنا لازمی ٹھہرتا ہے شاید اس لئے بھی کہ وہ ایک حد تک اُس کی راز دان تھی۔ یہ گھٹن اس وقت دور ہوتی ہے جب چھوٹی بہن کی شادی ٹھہرتی ہے۔ اسی بہانے

دفن کی ہوئی محبت بھی زندہ ہو جاتی ہے، باپ سے رہا نہیں جاتا۔ اس کی حسرت کا اندازہ کچھ اس اقتباس سے ہوتا ہے۔

''شادی کے اس ہنگامے میں ابھی تک اُس کا کوئی ذکر نہیں آیا تھا۔ پھر ایک دن اماں نے یہ بات چھیڑ ہی دی:

''شادی پر بشریٰ کو نہیں بلاؤ گے؟'' اماں نے چاولوں کی چھان پھٹک کرتے ہوئے بات چھیڑی۔

''ابا نے چونک کر اماں کی طرف دیکھا۔ اُن کے چہرے پر ایک لمحہ کے لیے چمک سی آئی۔ لیکن پھر فوراً ہی اُن کا چہرہ بُجھ کر پتھر کی طرح بے جان اور بے حس ہو گیا۔ وہ فوراً وہاں سے اُٹھ کر کمرے کے اندر چلے گئے۔

''فرخندہ کچن میں کھانا تیار کر رہی تھی۔ کام چھوڑ کر وہ بہانے سے کمرے کے سامنے سے گزری۔ ابا کا سوکھا ڈھانچہ کرسی پر ڈھیر تھا اور وہ سامنے کی دیوار کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ اُن کی انگلیوں میں پھنسا ہوا سگریٹ دھوئیں کے ساتھ سُلگ رہا تھا۔''

علاوہ ازیں پتھر کے چہرے میں اس Possessiveness میں معاشی مجبوری بھی شامل ہو جاتی ہے۔ بظاہر اسے لالچ نہیں کہنا چاہیے۔ پتھر کا چہرہ ایک تہہ دار علامت ہے۔ دوکان سے خریدا ہوا پتھر کا چہرہ اپنی بے حسی کا سایہ کہاں کہاں نہیں ڈالتا۔ بہر حال یہاں مسئلہ معاشی مجبوری کا بھی ہے جو نادانستہ طور پر ان ہمدردانہ سوچوں میں اظہار کی راہ پالیتی ہے۔

''کھانے کے دوران وہ گھر کی ضرورتوں کے بارے میں سوچتی، کتنا خرچہ بڑھے گا، کتنی رقم کی ضرورت ہوگی، اسے کتنی فالتو محنت کرنا پڑے گی''،

''اور ماں اس بار تم پچاس روپے الگ نہیں کرو گی''۔ لاشعوری طور پر اس نے مان لیا تھا کہ جس مقصد کے لیے یہ پچاس روپے الگ کئے جاتے تھے وہ ''اسے'' حاصل نہیں ہوگا اور آخر ایک دن حقیقت لبوں پر آ ہی جاتی ہے۔

''ماں سلمٰی کا خیال کرو میرا پیچھا چھوڑو، مجھے نفرت ہے ان لالچی لوگوں سے''۔

''لالچی'' کی زد باہر کی طرف لپکتی ہوئی آنے والے مہمانوں پر تو پڑتی ہے لیکن شاید Recoil کے طور پر ہی سہی اس کی زد ماں پر بھی پڑ رہی ہے۔ پہلے وہ کبھی کبھی سوچ لیا کرتی

تھی ''کیا وہ سچ مچ کسی کی دلھن بنے گی'' بالآخر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔''ماں سلمٰی کا خیال کرو، میرا پیچھا چھوڑو''۔ بظاہر جھنجھلاہٹ لیکن بقول غالب ''اپنی شکست کی آواز''۔

گھن میں مسئلہ ایک اور پس منظر میں ظاہر ہوا ہے۔ یہاں ''شد پریشاں خواب ما از کثرت تعبیر ہا'' والی صورت کارفرما ہے۔ آخر میں ماں کی حقیقت پسندی خیر خواہوں کے مشوروں پر غالب آتی ہے تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

عفراء بخاری کے کردار نہ نفسیات زدہ ہیں، نہ طبقات زدہ، نہ دانش زدہ۔ وہ تو بس عام سے کردار ہیں اور عام سے واقعات کی کٹھالی میں ڈھلے ہوئے۔ تاہم عام آدمی کا کردار بھی کبھی اتنا اتھلا نہیں ہوتا۔ کہیں نہ کہیں تحت الشعور یا لاشعور میں کوئی گرہ پڑ ہی جاتی ہے۔ اس میں ہذیانی کیفیت پیدا نہیں ہوتی تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس فرقۂ زہّاد سے کوئی کامل کم کم ہی اٹھتا ہے، کوئی مجذوب ظاہر ہو جائے تو الگ بات ہے۔ اسی اعتبار سے ان کے ہاں زبان و بیان میں بھی کوئی تصنع ہے نہ آرائش۔ روزمرہ کے واقعات ہیں اور روزمرہ کی زبان، البتہ انہی واقعات اور اسی بیانیہ میں کچھ رموز اپنی جھلک دکھا جاتے ہیں۔

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے

اصل میں اب مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ موضوع مجھ سے سنبھالے سنبھل نہیں رہا اور تاب گفتار کہتی ہے بس!

چھینٹ کا لحاف

بہت سی چھوٹی بڑی خواہشوں کے درمیان اُس کی ایک بڑی خواہش یہ بھی تھی کہ ماں اسے شادی میں چاہے کچھ اور دے یا نہ دے، سرخ اطلس کی لش لش کرتی ایک رضائی ضرور دے... جس کے حاشیئے سبز ریشم کے ہوں۔ مگر اس کی ماں بڑی دور اندیش تھی۔ وہ جانتی تھی، گودڑوں میں پلی گودڑوں میں ہی جائے گی۔ اس سے بڑھ کر اس کی قسمت نہیں ہو سکتی۔ اسے ماں کی یہ سوچ اچھی نہیں لگی تھی۔ ماں کو اس کے بارے میں یوں فیصلہ نہیں دینا چاہیے تھا۔ مگر ماں کا خیال تھا کہ پرائمری سکول میں پڑھ کر اس کے دماغ میں فتور آ گیا ہے اور وہ ایسی ڈونگی باتیں سوچتی ہے جو اسے نہیں سوچنی چاہئیں۔ اسی لیے اُس نے اطلس کی ریشمی رضائی کی بجائے اُسے چھینٹ کے مضبوط کپڑے کا لحاف دیا.... جس کے سبھی رنگ پکے اور گاڑھے تھے۔

لحاف میں اُس نے بڑی فراخدلی سے چھ کلو روئی ڈلوائی اور اپنے ہاتھ سے مضبوط ٹانکے لگا کر سیا۔ جب وہ اس موٹے لحاف میں لمبی سوئی سے ٹانکا بھرتی، تو وہ دیکھتی کہ ماں کی پور سے خون کی بوند ٹپکتی اور ٹانکے کے اوپر جا گرتی۔ لحاف کے ہر ٹانکے میں ماں کے خون کی حِدّت اور اُس کی آنکھوں میں تیرنے والے آنسوؤں کی نمی موجود تھی۔ پھر بھی اُس کے دل میں ماں کے خلاف غصہ تھا۔ ماں نے جیسے اُسے بھی لمبی سوئی سے ہمیشہ کے لیے اُس بھدے لحاف کے ساتھ سی دیا تھا اور یوں اس کے نصیبوں کو اپنے نصیبوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے جوڑ دیا تھا۔ ماں نے ایسا کیوں کیا؟ وہ کچھ اور بھی تو ہو سکتی تھی۔

اس رات جب اس کا دل خوف، غم، خوشی اور اُمنگ کے مِلے جُلے جذبات سے بھرپور

تھا، چھینٹ کے اس موٹے کھردرے لحاف میں لیٹ کر وہ رو پڑی تھی۔ اس کا خیال تھا، اُس کا میاں ضرور اُس کے آنسو پونچھ کر اسے دلاسا دے گا تب وہ اُسے اپنا دکھ بتا دے گی اور صاف صاف کہہ دے گی کہ اسے ایک اطلس کی سرسراتی رضائی چاہیے... بس اور کچھ نہیں۔ اس کی عمر بھی بس اتنی تھی کہ وہ ایسی ہی بات سوچ اور کہہ سکتی تھی۔ لیکن اس کا میاں جو کچہری میں ایک پرانی سی میز کرسی پر بیٹھ کر لوگوں کے کاغذ ٹائپ کرتا تھا اور ایک ایک گاہک کے لیے اسے کافی خواری اُٹھانا پڑتی تھی، صاحب جی... سر جی! کہتے اس کی زبان سوکھ جاتی تھی، مدت گزری اپنی عزتِ نفس کھو بیٹھا تھا۔ اب وہ ایک سوکھا ڈنٹھل تلخ آدمی تھا۔ وہ لطیف جذبات کی باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتا تھا اور اس وقت تو وہ کسی گدھی یا خچر کو ہانکنے والے اجڈ گنوار جیسا تھا۔ اس نے بڑی بے رحمی سے کہا تھا:

''بند کرو یہ ٹسوے بہانا۔ مجھے بہتی ناک والی عورتیں پسند نہیں ہیں۔ گھن آتی ہے مجھے اور یہاں آنے سے پہلے تیری ماں نے تجھے کچھ نہیں سمجھایا تھا کہ میاں کو جا کر کیسے خوش رکھنا ہے۔ اُٹھو اور یہ کھیڑی اُتارو میرے پاؤں سے۔ میں ان بھوکے ندیدے مردوں میں سے نہیں ہوں جو عورت کو دیکھتے ہی اپنی بدھی کھو بیٹھتے ہیں۔ میں تو ان جی دار مردوں میں سے ہوں جو قینچی سے عورت کو سدھاتے ہیں۔'' پھر وہ اپنے پیلے دانت نکال کر ہنسا تھا،

''لگتا ہے تمہیں بھی سدھانا پڑے گا۔'' اور یوں وہ چھینٹ کے لحاف میں اس طرح سما گئی کہ پھر کبھی اطلس کی رضائی اسے کہیں دور دور تک نظر نہ آئی۔ ماں کے بعد میاں کی بھی مکروہ اور بے رحمانہ یادیں لحاف کے ساتھ ہمیشہ کے لیے وابستہ ہو گئیں۔ اور اس نے اس لحاف کو ہمیشہ ایک عذاب کی طرح جھیلا۔

یہ لحاف جو اس کے لیے عذاب تھا، بچوں کے لیے اس میں بڑی کشش تھی۔ اس کے سارے بچے اسی میں اس کے ساتھ چمٹ کر سوئے۔ اُن سب کی خوشبو اور سانسیں اس لحاف میں رچی بسی ہوئی تھیں۔ وہ اس میں سب کی خوشبو کو الگ الگ پہچان سکتی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ اوپر تلے کے بچوں نے لحاف کی درگت بنا ڈالی۔ بچے بڑے ہو گئے مگر اس لحاف کی کشش نہ گئی۔ تب بھی اسی میں گھس کر کھیلتے کودتے، کھیل کھیل میں یوں کھینچا تانی کرتے کہ روئی اِدھر اُدھر کھسک کر پھوسٹروں کی طرح لٹک گئی تھی۔ یوں جھمل ماتا مارتے کہ

آخر کو لحاف بُکل مارنے کے لائق رہ گیا تھا۔ ہر سال کون دھلواتا دھنکواتا۔ دو چار سال تو اسی سوچ میں گذر گئے۔ بچوں کے پیشاب اور اُلٹے دودھ کی بُو، پھر دوائیوں کی کسیلی سی ہمک، سب اس کے اندر سمائی تھی۔ دھوپ میں ڈال ڈال کر پاپڑ ہو گیا تھا، پھر بھی چھوٹے بڑے سبھی بچے اسی لحاف میں گھسنے کے لیے بسورا کرتے۔ ان گودڑوں میں جانے کیا کھنچ تھی کہ ماں کی گود جیسا مزا لیتے۔ وہ حیران ہوتی اور انہیں کھینچ کھینچ کر باہر نکالا کرتی۔

''ارے کم بختو کچھ تو باقی رہنے دو۔''

وہ بڑے اُوپرے دل سے کہتی اور لحاف کو یوں گھلتے مٹتے ہوئے دیکھا کرتی۔ نئی رضائی دلائی بنانے کی بس حسرت تھی مگر ایسا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ یوں سینت سینت کر تو گزر بسر ہو رہی تھی۔ میاں کے لچھن کچھ ایسے ہی تھے کہ بہانوں بہانوں سے روپیہ بٹور کر ٹھکانے لگایا کرتے۔ ایسی ہی کچھ لتیں پڑی تھیں۔ ماں کے لاڈ پیار سے بگڑے تگڑے، کچھ دوستی یاری کی پھٹکار تھی۔ پھر اوپر سے کبھی بھنگن پسند آ جاتی، کبھی جولاہی جچنے لگتی اور کبھی دھوبن پر لٹو ہو جاتے۔ اس کے سامنے ہی ہاتھ پکڑ کر تھوڑی بہت بے شرمی دکھا جاتے۔ اس کی کیا مجال کہ ٹوک جاتی۔ اُلٹے ہاتھ کا ایسا جھانپڑ پڑتا کہ دنوں ناک منہ سُوجے رہتے۔ منہ کو بھی لگی تھی۔ نچلے دالان کی ایک الماری میں تالا ڈال رکھا تھا۔ دفتر سے آتے ہی وہیں سے برانڈی کی بوتل نکال کر پانی ملا، گھونٹ دو گھونٹ پیتے۔ باپ کے آنے کی خوشی میں بچے مگ میں منہ ڈال کر چلاتے۔

''ابا جی... ابا جی۔''

اور نیچے سے ایک ہلکی سی نشیلی آواز سنائی دیتی... ''ہاؤ... ہو... ہاؤ'' اور بچے خوشی اور جوش سے ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ مگر کبھی جب بات کرتے منہ سے بساند آتی تو بچے کہتے:

''اماں... ابا منجن نہیں کرتے'' اور وہ ہوں ہاں میں بات ٹال جاتی۔ بادام کا چھلکا جلا کر منجن بنتا۔ کبھی کبھی وہ الائچیاں پیس کر ساتھ ملا دیتی... کچھ تو پردہ ڈھکے۔

مہر کا ڈھائی ہزار بخشواتے، میاں نے زمین کے بہانے اس کا چھوٹا موٹا ڈنڈی چھلا بھی پار کر دیا تھا۔ مہر کے ڈھائی ہزار بھی انہیں برسوں سے کھٹک رہے تھے۔ ساس اُٹھتے بیٹھتے طعنے معنے دیا کرتی:

''اری میاں کی اتنی بیرن تو کوئی نہ ہو گی''... پھر جانے کہاں کہاں سے مثالیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتی۔ ایسا ناک میں دم کیے رکھا۔ اوپر سے میاں روز ڈھول دھپا کرتے۔

''بس اب انہیں ڈھائی ہزار میں اپنا کفن دفن کرنا، بیماریوں پر لگانا۔ مجھ پر کوئی آس نہ رکھنا۔''

وہ یہ سب سنتی اور ایک ڈھیٹ سی چپ اُس کے منہ پر رہتی مگر دل ہی دل میں رَٹے جاتی۔ ''نہیں بخشوں گی...'' کبھی دو ٹکے کی چیز تو خود سے خرید کر نہ دی۔ یہ ڈھائی ہزار تو واجب تھے جن کے بارے میں وہ اکثر سوچتی...شاید کبھی کسی دن وہ لوٹا دیں۔ اس کی ہتھیلی پر پہلی بار اتنی بڑی رقم رکھ دیں۔

''لو بھئی اپنا ادھار...''

اور وہ جذباتی ہو کر کہے... ''بھلا مجھے کیا کرنا ہے ان روپوں کا''...اور وہ اپنی ہتھیلی اُن کی ہتھیلی پر اُلٹ دے۔ بس اس لمحے کی اس احمقانہ خوشی کی خاطر وہ برسوں سے چپ چاپ پٹتی اور بے عزت ہوتی آئی تھی۔ پھر جب یہ جذباتی دور گزر گیا، وقت نے دل کی گہرائیوں میں ریت بھر دی اور سارے جذبے چکنا چور ہو گئے، اس کے بال پک گئے تو اس کی سوچ بھی بدل گئی۔

وہ اپنے میلے اُلجھے وجود کے ساتھ گھر کی میلی پرانی چیزوں کے درمیان اب بھی ان ڈھائی ہزار روپوں کے بارے میں سوچا کرتی جو کہیں بھی نہیں تھے، پھر بھی کسی ٹھوس حقیقت کی مانند اس کے ذہن کے کسی کونے میں جمع پڑے تھے جنہیں وہ نکال نکال کر گنتی رہتی۔ اور اس خیالی سہارے سے خواب بُنا کرتی۔ گھر میں کتنا کچھ بدلنے والا تھا، خاص طور پر یہ گودڑ لحاف۔ وہ ڈھائی ہزار اسے خواب و خیال کی دنیا میں لے اُڑتے...صاف ستھرے بستر، اطلس کی ریشمی رضائی... وہ اونچی اڑانوں میں کہاں کہاں اُڑتی۔ ڈھائی ہزار کا تو بس بہانہ تھا...اور جب خواب و خیال کی دنیا سے لوٹتی تو میلے گودڑوں میں ٹھٹھر کر رہ جاتی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی ناکام و نامراد زندگی کا واحد سہارا وہ ڈھائی ہزار ہی تھے... جو تھے بھی اور نہیں بھی تھے۔ وہ جنونیوں کی طرح تنہا بیٹھی ادھیڑ بن میں لگی رہتی... اگر وہ مل جائیں تو... یہ انوکھی رقم اس کے میاں اور اس کی ساس کو بھی نہیں بھولی تھی۔ یہ تو بڑی ہتک کی بات تھی کہ وہ ابھی تک اس کے

دین دار تھے۔

پچھلے بیس برس سے وہ اس کے نان نفقہ کے ذمہ دار تھے۔ وہ سب کیا مفت کا مال تھا۔ واہ... کھاؤ پیو سب ادھر سے... اوپر سے پیسے کا رعب الگ۔ پھر ایک دن جب اس کے میاں نے اُسے بورے کی طرح گھسیٹ کر گھر کی دہلیز پر بٹھا دیا تو ان ڈھائی ہزار روپوں کے سارے خوابوں کی بنت ادھڑ کر رہ گئی۔ اس بربادی پر اس کا دل خون ہو گیا۔ وہ کیا کرتی، کدھر کو جاتی۔ جانوروں کے بھی باڑے ہوتے ہیں، ٹھکانے ہوتے ہیں مگر اس کے لیے کوئی سمت نہیں تھی۔ پھر چھوٹے کی گھٹی گھٹی چیخیں اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئیں۔ اس کے خون خون دل نے بین کیا:

''نہیں بخشوں گی... کبھی نہیں''... مگر جب وہ ڈھیٹوں کی طرح اندھیرا اپڑے رینگ کر اندر آئی اور بچوں نے بھیگی رحم بھری نظروں سے اسے دیکھا تو اُس نے کورے کاغذ پر دستخط کر دیے۔

''لکھ لو... جو جی چاہے لکھ لو... چاہے طلاق نامہ ہی لکھ دو۔''

پھر اُس نے سسکیاں بھرتے چھوٹے کو کلیجے میں بھر لیا تھا اور اُس کے منہ پر منہ رکھ کر دھاروں دھار روئی تھی۔ اُس رات جب اس کا وجود کہیں بھی نہیں رہا تھا، منیر نے اچانک سالن کی کٹوری اُٹھا کر زمین پر دے ماری... اس میں سے دادی کا سفید بال نکل آیا تھا۔

''اُخ تھو! میں نہیں کھاؤں گا۔''

اس کی بھیگی مسوں اور تیکھے نقوش والا چہرہ تر بتر تھا اور حلق میں ہچکیاں ٹوٹ رہی تھیں۔ اُس نے حیرت بھری نظروں سے منیر کی طرف دیکھا... تو وہ تھی...!!

''تیری یہ ہمت''... میاں نے چولھے سے جلتی لکڑی کھینچی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر اوندھی ہو گئی۔ منیر بھاگا اور پھر واپس نہیں آیا۔

وہ کہاں ہوگا، کس حال میں ہوگا، یہ سوچ سوچ کر وہ گھلتی رہی۔ برسوں اپنے پھٹتے رِستے کلیجے پر ہاتھ رکھے اس کے انتظار میں آتی جاتی سانسیں گنتی رہی۔ اور سردیوں کی یخ بستہ راتوں میں جب سب دروازے بھیڑ کر سو جاتے، وہ چپ چاپ باہر کا دروازہ کھول دیتی اور اندھیرے آنگن میں کھلے آسمان کی پوری وسعت کے نیچے سر جھکا کر کھڑی ہو جاتی اور فریاد

کرتی۔ سردی اس کی ہڈیوں میں گھلتی رہتی...

''منیر تم جانتے ہو مجھے سردی بہت لگتی ہے۔ تم واپس آ جاؤ، تمہارے لیے سرخ اطلس کی رضائی بنواؤں گی جسے اوڑھ کر تم بہت خوش ہو گے۔''

وہ جنونیوں کی طرح رو رو کر اس سے باتیں کرتی اور واسطے دیتی۔ آخر اس کی آہ و زاری قبول ہوئی۔ آسمان کی گھمنڈی بلندیوں کو اس حقیر اور عاجز عورت پر ترس آ گیا۔

ایک دن منیر کا خط، باپ کے نام آیا۔ وہ چولھے کے قریب راکھ کی طرح ڈھیر تھی جب میاں لفافہ ہاتھ میں لیے اندر آئے اور تمتماتے چہرے کے ساتھ وہ خط ماں کے سامنے لہرایا...

''اماں مبارک ہو! منیر کا خط آیا ہے۔ لو تمہاری دعا قبول ہوئی۔ وہ زندہ ہے۔ دیکھو کتنا سامان بھیجا ہے دبئی سے''... میاں اونچی آواز میں، کہ وہ بھی سُن لے، کہہ رہے تھے۔ ''واہ! میرا شیر جوان بیٹا۔ بیاہ ہو گیا ہے اُس کا۔ سُن رہی ہو اماں، لکھتا ہے دادی کی دعائیں لگ گئی ہیں، بڑی موج میں ہوں۔ یہ لو گرم چادر بھیجی ہے تمہارے لیے''

اس خط پر تو سب سے زیادہ اس کا حق تھا۔ روٹی سینکتے ہوئے اس نے نظر اُٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہیں کی۔ منیر نے باپ کے لیے گرم سوٹ، صغیر کے لیے سویٹر اور بہنوں کے لیے کمبل بھیجے تھے... اور اس کے لیے چارموم کا دوپٹا...

چارموم کا ٹھنڈا ٹھار دوپٹا ہاتھ میں بھینچ کر وہ دیر تک گُم سم سی رہی۔ وہ تو جانتا تھا کہ اسے بہت سردی لگتی ہے... چھینٹ کے موٹے لحاف میں بھی کانپا کرتی تھی... ایک دن منیر نے اسے کہا تھا، ''اماں مجھے بڑا ہو جانے دے، میں تیرے لیے نئی رضائی بنواؤں گا''...

''ہاں سرخ اطلس کی''... اُس نے جملے کو آگے بڑھایا تھا۔ ''لش لش کرتی... سرسراتی... ہے نا...'' پھر وہ دونوں ہنس دیے تھے۔

منیر کے بھیجے ہوئے کمبلوں کو وہ دیر تک ہاتھوں میں پکڑے رہی اور انہیں گہری گہری نظروں سے دیکھتی رہی۔ نرم ملائم، ہلکے پھلکے، چار تہوں میں چھوٹے ہو جانے والے، عجیب و غریب، جہاں جی چاہے رکھ دو، ہر جگہ سمانے کے لیے تیار۔ وہ حیران ہوئی کہ دنیا میں ایسی اچھی اور انوکھی چیزیں موجود ہیں... آرام دہ، راحت بخش... اور وہ کتنی چھوٹی دنیا میں رہی تھی۔ عمر بھر اس چھینٹ کے لحاف کا عذاب سہتی اور اس میں سڑتی رہی۔ اس نے کمبلوں کو بار بار

چھوا اور ہر بار حیرت انگیز پایا۔ انہیں اوڑھ کر سونے میں شاید اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی راحت ہوتی۔ مگر یہ کمبل آمنہ، صادقہ کے لیے تھے۔ اُس نے کمبل صندوق میں رکھ کر نیم کی پتیاں ڈال دیں۔ اُسے پورا یقین تھا کہ منیرا سے بہت جلد ایسا ہی کمبل بھیجے گا۔ تب وہ اس بدعا جیسے لحاف سے رہائی پالے گی۔ وہ بہت خوش اور مطمئن تھی۔ اُس نے لحاف کو دھلوا کر ایک کونے میں ڈال دیا۔ آتی سردیوں میں وہ گرم کمبل اوڑھ کر سوئے گی۔ اگر ماں زندہ ہوتی تو اسے ضرور جا کر بتا دیتی کہ اس کا نصیب اس جیسا نہیں تھا... جیسا اُس نے سوچا اور کہا تھا۔

لیکن اب کے جو دو کمبل آئے وہ عائشہ چچی اور سلیمہ ممانی کے لیے تھے۔ انہوں نے بڑی فرمائش سے منگوائے تھے۔ وہ حیران اور چپ رہ گئی اور اُوپرے دل سے اُس نے کہا۔

''ہاں! اچھا ہے، عزیزداری نبھانی چاہئے۔'' مگر پھر تو وہ ہر آنے والے کمبل پر اپنا نام ہی ڈھونڈتی رہ گئی... قطار کے آخر میں کھڑے شخص کی طرح جو بڑے صبر اور تحمل و قناعت سے اپنی باری کا انتظار کرتا ہے۔ پھر آتی سردیوں میں وہ بڑی مردہ دلی سے اپنا وہی پرانا لحاف اُٹھا کر پلنگ پر رکھ دیتی۔

یہ پرانا لحاف اب اس کے کمزور جسم پر بہت بھاری لگتا۔ وہ اس میں سمٹ کر لیٹ جاتی اور خاموش نظروں سے خلا میں کچھ دیکھتی رہتی یا پھر لحاف میں بچوں کی الگ الگ خوشبو کو پہچاننے کی کوشش کرتی۔ جیسے اپنے کھوئے ہوئے بچوں کو تلاش کر رہی ہو۔ پھر اسے ماں یاد آتی... لمبی سوئی سے ٹانکے بھرتی۔ بس اس کا یہی ایک آخری تصور اس کے پاس رہ گیا تھا۔ وہ سوچتی، اطلس کی رضائی کب تک اس کا ساتھ دیتی۔ اس ٹھنڈے گھر میں تو وہ اس رضائی میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر جاتی۔ اچھا ہی ہوا جو یوں نہ ہوا۔ چھینٹ کا یہ لحاف برسوں برس گرم کا گرم رہا... چھ کلو روئی اوپر اور چار کلو روئی نیچے۔ مگر اب وہ گودڑ ہو گیا تھا۔ اب اس میں وہ گرمی بھی نہ رہی تھی۔ دھلوانے دھنکوانے پر بھی ویسے کا ویسا ہی رہتا۔ وہ اسے اوپر تک کھینچ لیتی تاکہ اس کے سانسوں کی کچھ گرمی اس میں شامل ہو جائے۔ مگر اب اس کے سانسوں میں بھی وہ گرمی کہاں رہی تھی۔ وہ رات کو سوتے میں کپکپایا کرتی اور اس کپکپاہٹ میں وہ بچوں کے سانسوں کو اس میں محسوس کرنے کی کوشش کرتی۔ شاید ان کھوئی ہوئی سانسوں کی حدّت اسے سکون دے جائے۔ پھر وہ دل گرفتگی سے خواہش کرتی کہ منیرا سے خود بخود ایک کمبل بھیج دے... نرم

روؤں والا، گرم اور خوبصورت کمبل۔

خود سے کچھ مانگنے کی اسے نہ عادت تھی نہ سلیقہ۔ البتہ وہ صبر و قناعت کے ساتھ لمبا انتظار کر سکتی تھی۔ مدتوں پہلے جب وہ اپنے میاں کے ساتھ زندگی ترس ترس کر گزار رہی تھی، اُس نے سوچا تھا کہ اس کے پاس کوئی جادو کی چھڑی تو نہیں ہے مگر یہ بچے اس کے لیے جادو کی چھڑی ہیں۔ ایک دن وہ اسے گھما کر سب کچھ بدل ڈالے گی۔ وہ اپنی ماں کی طرح اپنا نصیب کسی کو نہیں دے گی۔ بچوں کو بڑا ہونے میں کافی دن لگے۔ لیکن اب، جب وہ بڑے ہو گئے تھے تو اسے معلوم ہوا کہ وہ اس جادو کی چھڑی کو گھمانا نہیں جانتی... وہ صرف رُک کر، تھم کر گرین لائٹ کا انتظار کر سکتی ہے۔ شاید وہ کسی روز اُس کی گمبھیرتا سے اُسے کھوج نکالیں۔

مگر وہ سب بہت مصروف ہو گئے تھے۔ ان کے لیے اپنے بڑھتے ہوئے تیز رفتار قدموں کو روکنا مشکل تھا۔ انہیں نئے معاملات کو نپٹانا تھا، نئی ذمہ داریوں کو پورا کرنا تھا... نئے رابطے نئے تعلق، نئے رشتے۔ پھر ماں پر انہیں پورا بھروسہ تھا۔ وہ ان کے لیے رکاوٹ یا مشکل پیدا نہیں کر سکتی۔ اور وہ یہ سب بھی تو ماں کی خاطر ہی کر رہے تھے۔ وہ اپنے تمام معاملاتِ لین دین سے ماں کو باخبر رکھتے۔ یہ بہت ضروری اور اہم تھا۔ کیونکہ یہ سب آخر ماں کی وجہ سے تھا۔ ماں کو شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہئے تھا۔ یقیناً ماں یہ جان کر خوش اور مطمئن ہو گی کہ وہ آپس میں کِس قدر پیار و محبت سے نباہ کر رہے تھے، ایک دوسرے کی ضروریات کا کتنا خیال کیے ہوئے تھے۔

ہر گھر میں دوبئی سے آیا ہوا سامان موجود تھا۔ ہر گھر کے بیڈ روم میں منیر کے بھیجے ہوئے کمبلوں کی رونق تھی... نرم و ملائم اور گرم کمبل۔ اور وہ ہر سردی میں وہی لحاف اُٹھا کر اپنے پلنگ پر رکھ لیتی۔ آمنہ، صادقہ کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ اس نے جہیز میں انہیں کیسی اچھی، زندگی کو آسان تر بنا دینے والی چیزیں دیں، جو اس نے نہ کبھی دیکھی تھیں، نہ استعمال کی تھیں۔ وہ تو اب بھی رنگین چٹو میں دھما دھم مصالحہ کوٹتی پیستی، صابن رگڑ رگڑ کر کپڑے دھوتی، لکڑی کی ڈوئی مٹی کی ہنڈیا میں چلاتی اور استری کے لیے کوئلے دہکاتی۔ کوئلوں کی سفید بھوبھل اُڑ کر اس کے بالوں میں چلی جاتی اور وہ اسی پرانے طریقے سے بال جھاڑتی۔ اس کے لیے تو کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ وہ اب بھی اپنی سوچوں میں ماں کو دیکھتی۔

اب وہ اس گھر میں اکیلی تھی۔ گھر اور اس کی پرانی میلی چیزوں سے اُس کا دل اُوبھ گیا تھا۔ اُجلی خوبصورت چیزوں کی ہوک اس کے اندر پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ وہ پرانے چپ پڑے صندوق کھول کر دیکھتی۔ پرانی کالی پتیلیوں کو ریت سے رگڑ رگڑ کر چمکاتی، پھر بھی سب کچھ میلا میلا سا رہتا۔ گھر ایک بے ترتیب ٹوٹے پھوٹے بے ڈھنگے انبار کی طرح دکھائی دیتا جسے درست کرنے کی سکت اب اس میں نہیں تھی۔ وہ اپنی کم ہمتی اور ناچاری پر رو پڑتی۔ وہ تو ایک نیا گھر بنانا چاہتی تھی... بس اتنا کہ وہ اس کی دیواروں کو آسانی سے چھو لیتی اور اس کے اندر رہتے ہوئے کسی دوری کا احساس نہ ہوتا۔ مگر اب وہ تھک گئی تھی۔ کالی پڑی دیواروں کے اوپر ہر کونے میں لمبی ٹانگوں والی مکڑیوں کے جالے تھے اور چھتوں سے چونا گرتا تھا، فرش اُکھڑ گئے تھے اور اینٹوں پر سبز کائی جمی تھی۔ گھرے میں گندے برتنوں کا ڈھیر لگ جاتا... کالی پتیلیاں، ٹوٹی رکابیاں، پھوٹی پیالیاں، چپ پڑے سلور کے پتیلے، ٹیڑھے چمچے، بھرے کناروں والے گلاس... خراب ٹونٹی کا پانی ٹپ ٹپ ان پر مسلسل گرتا اور یہ ٹپ ٹپ اس کے اندر ایک خلجان، ایک دیوانگی پیدا کر دیتی۔

صغیر نے نیا ہیٹر خریدا تو اس نے اپنا پرانا ہیٹر ماں کو دے دیا۔ ''لو ماں... تم بھی آگ سینکو۔''

اُس نے وہ ہیٹر پرانی چیزوں کے بے ترتیب انبار میں رکھ دیا۔ اس گیس ہیٹر کی جالی عموماً ایک چھناکے سے نیچے گر جاتی۔ اور پھر یہ چھناکا اس کی سوچوں کا مرکز بن گیا۔ وہ اچانک ہڑبڑا جاتی اور جا کر اسے دیکھتی۔ جالی گری ہوتی تو اسے لگا دیتی اور ہیٹر بنانے والے پر کافی بڑبڑاتی۔

''کم بخت کوئی چیز بھی ٹھیک سے نہیں بناتے...'' چھناکا ایک وہم کی طرح اس پر سوار ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی ساری زندگی میں یہ ایک چھناکا ہی اہم رہ گیا ہے۔ وہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر ہیٹر کو دیکھتی۔

بالآخر ایک دن منیر کا خط آیا۔ سارے لین دین کے معاملات کی تفصیل لکھنے کے بعد ایک نوٹ تھا۔

''ماں تمہیں کچھ چاہیئے تو لکھ دینا۔''

ساری تفصیل کے بعد جب اُس نے یہ نوٹ پڑھا تو اُس کا اندر ٹھٹھر کر سنسان ہو گیا۔
اتنے بہت سے معاملات کیسے نپٹاتا ہو گا میرا منیر۔ کبھی سالگرہ، کبھی شادی، کبھی منگنی، کبھی نکاح، کبھی امتحان... اُف اکیلا کیسے سب کرتا ہو گا۔ وہ کچھ لکھتے لکھتے رُک گئی۔ مجھے کیا کرنا ہے کچھ منگوا کر؟ اپنا بوجھ بھی اُس پر ڈال دوں... نہیں... یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔ کبھی سہولت ہوئی تو خود ہی میرے جنجالوں کو جان جائے گا۔

منیر کو جب ماں کی طرف سے جواب نہیں ملا تو اُس نے ہلکے تبسم کے ساتھ سر جھٹکا۔

''ماں تم بھی عجیب ہو۔ تم پرانی چیزوں اور پرانی عادتوں کو نہیں چھوڑ سکتیں۔''

وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اُس کے اندر تو ہمیشہ سے نئی چیزوں کی ہوس موجود تھی۔ پرانی چیزوں کو دیکھ کر اُس کا دل اُلٹنے لگتا تھا۔ یہ تو ماں تھی جس نے زبردستی اپنا نصیب اس کے حوالے کر دیا تھا اور یوں گویا ایک حصار اس کے گرد کھینچ دیا تھا۔

''تم ہمیشہ اسی طرح رہو گی۔'' یہ ایک بددعا تھی جو ماں نے اُسے دی تھی... کسی جادو ٹونے کی طرح اُس نے موٹے لحاف میں لمبی سوئی چھبو چھبو کر کوئی منتر اس پر پھونک دیا تھا۔

پھر ایک دن منیر نے ڈبل بیڈ کا ایک خوبصورت کمبل بھیجا۔ ویسا ہی چار تہوں میں چھوٹا سا ہو جانے والا۔ جہاں چاہے رکھ دو۔ اُس نے ڈھیروں دعاؤں اور بے شمار آنسوؤں کے ساتھ اس انوکھی چیز کو چُھوا... ہاتھوں سے، گالوں سے، ہونٹوں سے... کسی بچے کی طرح اپنے سینے سے لپٹایا۔ کتنا خوبصورت، نیا نکور۔ وہ بار بار اسے چُھوتی رہی اور یوں گہرے سانس لیتی رہی جیسے ماں کی بددعا سے آزاد ہو گئی ہو۔ دکھوں اور محرومیوں کی ساری سوئیاں اُس نے خود اپنے کلیجے سے نکالی تھیں بس ایک باقی تھی کہ اُس نے کمبل کے ساتھ آنے والے خط کو پڑھا۔

''ماں مجھے بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔ میری کمائی اتنی نہیں ہے، پھر بھی میں نے تمہیں خوش کرنے کے لیے ہر ایک کی فرمائش پوری کر دی۔ اب میرے بچوں کی باری ہے۔ تم جانتی ہو چھوٹی اب بڑی ہو گئی ہے۔ یہ کمبل اس کے لیے ہے۔ اسے سنبھال کر رکھ لینا۔''

تمہارا فرمانبردار بیٹا منیر۔

وہ جانتی تھی چھوٹی کے بڑا ہونے میں ابھی بہت دن پڑے تھے۔

اُس نے زنگ آلود بڑے صندوق کو کھولا اور کمبل کو دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر صندوق

کی تہہ میں یوں سنبھال کر سہج سے رکھ دیا جیسے کسی عزیز کی لاش کو لحد میں اُتارا ہو۔ پھر اُس نے فنائل کی گولیاں ڈالیں اور صندوق کا ڈھکنا احتیاط سے بند کر دیا۔

وہ یہ سب کر کے اُٹھنا چاہ رہی تھی، جب اسے چکر سا آ گیا۔ کانپتے چکراتے وجود کے ساتھ وہ بمشکل اپنے پلنگ تک پہنچی اور موٹے بھاری لحاف کے اندر اس کا ہلکا پھلکا جسم بستر کی سلوٹ کی طرح سما گیا۔ کالی پڑی دیواریں جن کے اوپر کونوں میں لمبی ٹانگوں والی مکڑیوں کے جالے تھے اچانک اس کے بہت قریب آ گئیں۔ ان کالی دیواروں کے پاس اس نے اپنی ماں کو دیکھا جیسے وقت کے کسی گزرے لمحے میں پہنچ گئی ہو۔ اُس کی ماں لمبی سوئی کو خون ٹپکاتی پوروں میں پکڑے لحاف میں لمبے لمبے ٹانکے بھر رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے آنکھیں آہستہ سے بند کر لیں۔ اس وقت جب وہ بستر میں کسی سلوٹ کی طرح مجبور و لاچار پڑی تھی، یہ سب دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس وقت اس کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح اس لحاف کو اُتار پھینکے۔ اسی میں اس کی نجات تھی۔ وہ اس لحاف میں مرنا نہیں چاہتی تھی۔

مگر اس کا جسم یوں بے جان ہو گیا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ کی ایک اُنگلی کو بھی جنبش نہ دے سکی۔

اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اسے تازہ ہوا اور آکسیجن کی ضرورت تھی۔ اس نے ایک آخری کوشش کی کہ وہ کسی طرح لحاف کو اپنے اوپر سے پرے دھکیل دے مگر وہ جیسے جیسے ہلنے کی کوشش کرتی، لحاف مکڑی کے مکروہ کالے لیسدار جالے کی طرح اس سے لپٹتا چلا جاتا۔ وہ جتنا خود کو اس سے چھڑاتی اتنا ہی وہ مکروہ جالا اس سے چپکتا۔ اُسے ابکائی سی آ گئی۔ اُس نے مدد کے لیے کسی کو آواز دی۔ چند نام پکارے جن سے وہ یہ نہ جان سکی کہ اس کا کیا تعلق، کیا رشتہ تھا... بس اس کے ذہن میں بے معنی لفظوں جیسے نام رہ گئے تھے... باقی وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔

بے قابو

یہ فون کی گھنٹی تھی جو مسلسل بج رہی تھی۔

جب اُس نے ریسیور اُٹھایا تو وہ غنودگی میں تھا۔

کچھ دیر پہلے وہ گہری نیند میں ایک بھیانک خواب دیکھ رہا تھا اور خوف کھا رہا تھا۔ اُس کے پورے وجود پر کپکپی طاری تھی اور بند آنکھیں لرز رہی تھیں ۔ کچھ خوف اور اندیشے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ وہ ایک تنگ اور تاریک راستے میں بھاگ رہا تھا۔ راستے کے اختتام پر اسے ایک رکاوٹ دکھائی دے رہی تھی۔ یہ لوہے کی ایک موٹی تار تھی۔ اس تار کے پیچھے ایک انبوہ کثیر تھا جو ایک دوسرے کے سر اور کندھوں کے اوپر سے اس کی طرف ٹھہری ہوئی سرد نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ شکلیں جانی پہچانی تھیں مگر اس وقت اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون تھے۔

اس وقت وہ ایک بڑی مصیبت میں پھنسا تھا۔

اس کے ذہن میں کہیں یہ خیال موجود تھا کہ اگر وہ کسی طرح تار کے اس طرف پہنچ جائے تو سارے اندیشے خود بخود ختم ہو سکتے ہیں۔ مگر وہ جتنا تیز بھاگتا تھا اتنا ہی فاصلہ بڑھتا تھا اور راستہ تنگ ہوتا ہوا آگے ہی آگے چلتا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اس کے پاؤں شل ہو چکے تھے اور اب وہ تقریباً گھسٹ رہا تھا۔ اس کے پیچھے عجب کھڑکھڑاتی، کانوں کو پھاڑ دینے والی آواز تھی جیسے کسی بڑی سی کالی چیز کو سنگریزوں کے اوپر گھسیٹا جا رہا ہو۔ خوف سے پسینہ اس کے سر سے ایڑی تک بہہ رہا تھا۔

اُس نے بمشکل کندھوں کو تھوڑا سا موڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ تبھی ایک سُرخ اینٹوں

سے بھرا ٹرک کسی ہوائی چیز کی طرح پلک جھپکتے میں اس کے اوپر سے گزر گیا۔ وہ اوندھے منہ کالی مٹی میں جا گرا۔ معلوم نہیں کتنی دیر وہ یونہی مردے کی طرح مٹی میں پڑا رہا۔ پھر اسے کسی سرد اور ناخوشگوار لمس کا احساس ہوا۔ کوئی اُسے اُٹھا رہا تھا۔

اُس نے گھبرا کر سر اُٹھایا۔ یہ ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والا ہولناک منظر تھا۔ کچھ عجیب الخلقت ہیولے، جن کی وضع قطع اس دنیا کی کسی مخلوق سے نہیں ملتی تھی، سر سے پاؤں تک سیاہ لبادوں میں ملبوس کمر خمیدہ کیے اس پر جھکے تھے۔

ان کے ڈھکے ہوئے ہاتھوں کی ٹھنڈک کو اس نے اپنے جسم میں اُترتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ اسے یوں اُٹھا رہے تھے جیسے بہت سی چیونٹیاں کسی مردہ چیونٹے کو اُٹھاتی ہیں۔ دہشت سے وہ چیخا اور بھاگنے کی کوشش کی مگر اُس نے دیکھا کہ اُس کے پاؤں سفید رسی سے باندھ دیے گئے تھے اور وہ اپنے نئی تراش کے لباس میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی اور وہ اس night mare سے باہر نکل آیا۔ وہ پسینے میں شرابور تھا۔ اس نے ایک لمبا گہرا سانس لیا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ محض ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاؤں دراصل بستر کی چادر میں پھنس گئے تھے۔ اُس نے چادر ہٹا کر پاؤں باہر نکالے اور ریسیور اُٹھایا۔ ابھی غنودگی اس پر طاری تھی۔ پھر اچانک وہ بھونچکا سا رہ گیا جیسے کوئی انہونی بات سُن لی ہو۔ حیرت سے اس کا منہ کھل گیا اور ریسیور کان سے لگا ہی رہ گیا۔ کچھ دیر وہ وہیں سناٹے میں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

فون کی ساری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ایک بات تو واضح تھی کہ اسے وہاں جلد پہنچنا تھا بغیر کوئی وقت ضائع کیے۔ جس حالت میں وہ تھا اسی حالت میں۔ مگر دوسری خاص اور اہم بات جو اس کی سمجھ میں آتے آتے رہ گئی تھی اس کے ذہن سے خالی کاغذ کی مانند نکل گئی تھی۔ اب اسے یاد کرنے کی کوشش میں اسے لگا جیسے اس کے دماغ کی نازک نسیں پھڑ پھڑانے لگی ہیں اور مزید زور ڈالنے پر پھٹ بھی سکتی ہیں۔ اُس نے سوچا اس سے پہلے کہ کچھ ہو اسے فوراً گھر سے نکل پڑنا چاہیے۔ وہ پلنگ سے نیچے اترا۔ اس کا ذہن کچھ ماؤف سا ہو رہا تھا اور ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ ابھی تک وہ پورے طور پر بیدار نہیں ہوا تھا۔ اس کا آدھا جسم اور آدھا ذہن گویا سویا ہوا تھا۔ اگر فون کی گھنٹی نہ بجتی تو وہ بہت دیر تک سویا رہتا۔

وہ رات بہت دیر سے گھر پہنچا تھا۔ اس کے بیوی بچے دو روز کے لیے کہیں گئے ہوئے تھے اور وہ گھر پر بالکل اکیلا تھا۔ رات اُس نے ایک دوست کے ساتھ مل کر خلافِ معمول ایک ہوٹل میں کافی چٹ پٹا اور مرغن کھانا کھایا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کا معدہ بوجھل اور جسم تھکا ہوا تھا اور وہ فوراً ہی سو گیا تھا۔ سونے سے پہلے جو بھی اُلٹا سیدھا لباس اُس کے ہاتھ لگا اُس نے وہ پہن لیا تھا۔ دراصل وہ کافی سہل پسند آدمی تھا اور اپنے ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے بیوی کا محتاج۔

چپل پہنتے ہوئے اُس نے غور کیا کہ اس کا لباس مناسب نہیں تھا۔ کچھ میلا سا تھا اور چند بٹن بھی غائب تھے۔ اس نے سوچا لباس تو اسے بدلنا ہی ہوگا اگر اس کے ساتھ ساتھ وہ جلدی سے نہا بھی لے تو اس کی طبیعت کی کسلمندی بھی دور ہو جائے گی۔ پھر وہ جھٹ پٹ تیار ہو کر نکل جائے گا۔ آخر اس میں وقت ہی کتنا لگے گا۔ مگر یہ سوچ کر بھی وہ وہیں کھڑا منہ پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ شیو کے بڑھے ہوئے بال اُسے کانٹوں کی طرح چبھ رہے تھے۔

''شیو بنا لینی چاہیے۔'' اُس نے سوچا۔

لیکن نہیں اسے یوں نہیں سوچنا چاہیے۔ ایسی ہنگامی حالت میں وہ بڑی بے حسی سے کیسی باتیں سوچ رہا تھا اور کیسے کیسے خیال اسے آ رہے تھے۔ اُسے تو فوراً نکل پڑنا چاہیے تھا مگر وہ پھر بھی وہیں بے حس و حرکت کسی بت کی مانند کھڑا تھا۔ آخر اُسے ہو کیا رہا تھا۔ کیوں اتنے سنگین معاملے کو وہ پسِ پشت ڈال کر چھوٹی چھوٹی بے وقعت باتوں پر غور کر رہا تھا۔ اسے تو جلد پہنچنا تھا مگر وہ وہاں کھڑا کمرے کی حالت کو جانچ رہا تھا جو خاصی ابتر ہو رہی تھی۔ ابھی اس گزرتے لمحے میں اُس نے اِس بات کو محسوس کیا۔ اُس نے سوچا نہانے سے پہلے کیوں نہ کمرے کی حالت کو درست کر دے۔ اگرچہ وقت کم تھا مگر اس کام کے لیے زیادہ وقت درکار نہیں تھا۔ بس چند منٹوں میں وہ یہ کام نبٹا دے گا۔ اس کے ڈھیلے پڑے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ بے جان ہاتھوں سے چیزوں کو اُٹھا کر اپنی جگہ پر رکھنے لگا۔ اس کے ہاتھ سست رفتاری سے متحرک تھے اور قدم بھی رُک رُک کر اُٹھ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر پلنگ کے پاس گُم سُم کھڑا رہا پھر اس نے بستر کی چادر کو درست کیا۔ تکیے کا غلاف آدھا نیچے کھسک گیا تھا، اسے اوپر کھینچا۔ ایش ٹرے میں سے سگریٹ کے ٹکڑے باسکٹ میں پھینکے۔ وہ کام کر رہا تھا مگر اس کا

ذہن ابھی ماؤف اور اعصاب مردہ محسوس ہو رہے تھے۔
دو دنوں کے اخبار کمرے میں بکھرے پڑے تھے۔ انہیں سمیٹ کر رکھا۔ اُس کا ایک جوتا ایک کونے میں اور دوسرا دوسرے کونے میں اوندھا پڑا تھا۔ انہیں اُٹھایا اور ان میں سے گندی جرابیں نکال کر ٹب میں پھینکیں۔ میز پر کچھ گندی پلیٹیں پڑی تھیں جن میں باسی روٹی کے ٹکڑے اور ہڈیاں تھیں۔ انہیں بھی باسکٹ میں پھینکا۔ میز پر پانی کے گلاس میں ایک لمبی مونچھوں والا کاکروچ تیر رہا تھا۔ پانی کا گلاس اُٹھا کر غسل خانے میں لے گیا۔ ان چھوٹے موٹے کاموں کا کرنا اتنا ضروری بھی نہ تھا۔ مگر گزرتے وقت کے اس لمحے میں اسے یہ کام کرنے بہت ضروری لگ رہے تھے۔ پھر یہ کام زیادہ وقت نہیں لینے والے تھے۔ وہ خوامخواہ تذبذب میں پڑا تھا۔ اچانک اس کی نظر کلاک پر گئی۔ عجیب بات تھی آج الارم نہیں بولا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ فون کی رِنگ نے اسے جلد بیدار کر دیا تھا۔ اتنے میں الارم بول پڑا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر الارم بند کر دیا۔ اچانک اسے دبے قدموں مگر تیزی سے گزرتے وقت کا احساس ہوا۔ اسے بہت دیر ہوتی جا رہی تھی۔ مگر یوں افراتفری میں گھر کو اس حالت میں چھوڑ کر جانا بھی مناسب نہیں تھا جب کہ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی، قمیض کے بٹن غائب تھے اور سارا گھر بھنک رہا تھا۔ پھر جانے وہ کب لوٹے، لوٹے کہ نہ لوٹے۔ شاید وہاں رُکنا پڑ جائے۔ کتنا وقت لگ جائے۔ وہ عجیب پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کا ذہن اُلجھن میں تھا۔ یہ کام اس کے روزمرہ کے معمول میں شامل نہ تھے۔ اس کی بیوی سب سنبھالتی تھی۔ صبح جب وہ نہا دھو کر چیزوں کو اِدھر اُدھر پھینک کر چلا جاتا تو واپسی پر اسے ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر ملتی۔ اب اتنے سالوں بعد اُس نے سوچا اس کی بیوی کس قدر حوصلے والی تھی جو یہ سب برداشت کر رہی تھی اور اسے سنبھالے تھی۔ اس کے لیے تو خود اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ کاش اس وقت اس کی بیوی یہاں ہوتی تو وہ سب سنبھال لیتی۔ تب وہ اتنی مشکل میں نہ پڑتا۔ مگر حیرت اس بات پر تھی کہ وہ آج خلافِ عادت گھر پر اتنی توجہ کیوں دے رہا تھا۔ آخر کیوں وہ گھر کے چھوٹے چھوٹے کام کرنے پر تُل گیا تھا۔
اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے گھر کی دیواروں نے بڑھ کر اسے اپنے اندر جکڑ لیا ہے اور وہ اب ان کے حصار سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اسے گھر کا ذرہ ذرہ سانس لیتا محسوس ہو رہا تھا۔ گھر

کی ہر چیز گویا اس کی طرف متوجہ تھی۔ وہ اُلجھ سا گیا۔ اُس نے سوچا اُسے فوراً اس جادوئی اثر سے نکل جانا چاہیے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور اسے وہاں جلد پہنچنا تھا۔ ہاں واقعی اُس نے محسوس کیا کہ وقت کی رفتار آج بہت تیز تھی حالانکہ اسے ہمیشہ وقت کی سُست رفتاری کی شکایت رہی تھی۔ اسے ہمیشہ وقت تھما تھما سا لگتا اور وہ بے زار ہو جاتا۔ لیٹے لیٹے رات کتنی لمبی ہو جاتی... ختم ہونے میں نہ آتی۔ کروٹیں لیتے اس کا جسم ٹوٹنے لگتا، کمر اکڑ جاتی اور رگوں میں خون آہستہ بہتا۔

بعض اوقات دن لمبا ہوتا چلا جاتا۔ ایک ایک پل سل کی طرح سینے کا بوجھ بن جاتا۔ مگر آج وقت برق رفتاری سے گزر رہا تھا۔ اس نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی اور شیو بنانے لگا... شاید اس ہنگامی صورت میں یہ مناسب نہیں تھا جب کہ وقت بھی کم تھا۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ چہرے پر بار بار کٹ لگ جاتا۔ یہ تو بڑی نحوست کی بات تھی لیکن اسے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا تھا، وہ بدحواس ہو رہا تھا اور یہ ناقابلِ فہم تھا۔ آخر ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ یہ اضطرابی کیفیت اس پر کیوں طاری تھی؟ شاید جب انسان جلدی میں ہو ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ حواس کھو دیتا ہے، ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور وجود کانپنے لگتا ہے، ذہن میں سب کچھ گڈ مڈ ہو جاتا ہے اور وہ صحیح فیصلہ نہیں کر پاتا کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ نہانے کے لیے اس نے پانی کی ٹونٹی کھولی تو وہ چیخ پڑا۔ غلطی سے ٹھنڈے پانی کی ٹونٹی کھل گئی تھی۔ اسے تھوڑا سا غصہ آ گیا۔ اس کی خدمت گزار بیوی نے اُسے بالکل ناکارہ بنا دیا تھا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کمزور پڑتی جا رہی تھیں لیکن اس میں اس کا اپنا بھی قصور تھا۔ آخر وہ اپنے ہی گھر میں اجنبیوں کی طرح کیوں رہ رہا تھا۔ یہ سراسر اس کی اپنی کوتاہی تھی، نااہلی تھی، اس کا ناشکرا پن تھا کہ اُس نے کبھی کسی چیز کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔

نہا کر وہ سست قدموں سے کچن میں آیا۔ اُس نے سوچا چائے یا کافی کا ایک کپ اس کی طبیعت پر شاید اچھا اثر ڈال دے۔ سِنک میں گندے برتنوں کا ڈھیر دیکھ کر اسے بڑا قلق ہوا۔ اگر اچانک اس کی بیوی آ جائے تو وہ گھر کی حالت دیکھ کر کتنا پریشان ہو۔ پھر آنے والے پل کو کِس نے دیکھا ہے۔ جانے کیا ہو... کیا نہ ہو۔ ناقابلِ فہم خدشے اور وہم تھے اور وہ مخمصے میں پڑا تھا۔ کیا معلوم وہ پچھتاتا اور ہاتھ ملتا رہ جائے اور موقع ہاتھ سے نکل جائے۔ کوئی سانحہ کوئی حادثہ

کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اور سفر سے واپسی پر چھوٹے بچوں کے ساتھ گھر کو یوں اچانک دیکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ پھر حالات تبدیل ہو سکتے تھے، کوئی ہنگامی صورت ہو سکتی تھی جو بیوی بچوں کے لیے دوہری مصیبت کا باعث بن سکتی تھی۔ کم از کم گھر کی حالت تو انہیں ٹھیک ملنی چاہیے تا کہ وہ اچانک نمودار ہونے والے حالات و واقعات کا سامنا ہمت اور حوصلے سے کر سکیں۔ یہ ایک عجیب پریشانی تھی جس سے وہ دوچار تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اپنی بیوی اور بچوں کے لیے فکر مند ہوا تھا۔ اور وہ اس وقت اس لمحے ان کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا بلکہ بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔ گزرتے وقت کا بھی اسے احساس تھا۔

وہ تو اب جانے کو تیار تھا مگر وہ یوں اس حال میں فوری طور پر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اندر سے وہ بہت اداس اور دکھی ہو گیا تھا۔ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوئے جا رہا تھا۔ اچانک گھر اور گھر کی ہر شے اسے بہت عزیز اور پیاری ہو گئی تھی۔ وہ گھر کی دیکھ بھال کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی ابتر حالت کو درست کرنا چاہتا تھا کہ اس کی بیوی پریشان نہ ہو۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہمیشہ کے لیے ان سب چیزوں کو چھوڑ کر کہیں جا رہا ہو اور ان کی محبت اس کے اندر اُمنڈ پڑی ہو۔ اس کا ذہن اور جسم ابھی تک نیم غنودگی میں تھا۔ اس کے دماغ کی سوئی رگوں میں کوئی سمجھ نہ آنے والی بات اَٹکی ہوئی تھی اور اس بات کو یاد کرنے کی کوشش میں اس کا سر چکرانے لگا تھا اور دماغ کی نسیں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کوشش میں دماغ کے اندر دھماکے سے ہو رہے ہیں۔ اس نے سست، بے جان ہاتھوں سے گرم پانی سے سارے برتن دھو ڈالے۔ چھت کے ایک کونے میں اسے تھوڑا سا کالا جالا نظر آیا جو اسے خاصا بُرا اور بھدا لگا۔ اُس نے ایک لمبی چھڑی تلاش کر کے وہ جالا اُتار دیا۔ وائپر سے اس نے فرش صاف کیا اور کناروں پر تھوڑی سی کوپکس چھڑک دی تا کہ کیڑے مکوڑے نکلنے نہ پائیں۔ کچھ خالی بوتلیں نظر آئیں۔ ان میں پانی بھر کر اس نے فریج میں رکھ دیا۔

اس دوران اُسے محسوس ہوا کہ اس سے کچھ غلطیاں سرزد ہو رہی ہیں اور بار بار وہ کچھ نہ کچھ بھول جاتا ہے۔ ایک بار وہ پلٹ کر دوبارہ کچن میں آیا۔ اسے لگا کہ اس نے فریج کے دروازے کو اچھی طرح سے بند نہیں کیا اور سنک کی ٹونٹی بھی تھوڑی کھلی رہ گئی ہے۔ لیکن فریج کا دروازہ بند تھا البتہ ٹونٹی لیک کر رہی تھی۔ اُس نے پلاس ڈھونڈ کر اسے کس دیا۔ کھڑکی کی جالی

میں اسے ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آیا۔ اس میں بھی اس نے کاغذ ٹھونس دیا۔ اب وہ فارغ تھا۔ اب اسے جانا چاہیے تھا۔ مگر اُس نے محسوس کیا کہ وہ ابھی جانا نہیں چاہتا۔ بلکہ شاید کبھی بھی جانا نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر اسے معلوم تھا کہ اسے ہر حالت میں وہاں سے جانا تھا۔ یہ ایک ایسی حقیقت تھی جس نے اس کے جسم پر کپکپی سی طاری کر دی۔ اسے لگا جیسے جانے کے خیال سے اس کا وجود مٹی کے ڈھیر کی طرح بیٹھتا جا رہا ہے۔ یقیناً وہ اس خیال سے خوش نہیں تھا۔ کسی خوف سے اس کا دل ڈوب رہا تھا اور وہ تاخیر کے سبب پیدا کر رہا تھا۔ وہ ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔ ایک کے بعد دوسری سوچ... سرکش اور بے قابو، اسے مہلت دیے بغیر زَن سے گزر جاتی۔ ان بے شمار سوچوں کے بیچ میں سے یہ خیال پھر سے سر اُٹھا لیتا کہ اسے بہت جلد وہاں پہنچنا تھا۔ آخر وہ یہ بات کیوں بھلا رہا تھا۔ یہ عجیب اسرار تھا۔

وہ خالی الذہن ہو کر پورے گھر میں گھوما۔ گھر قیمتی اور خوبصورت چیزوں سے بھرا تھا۔ لاجواب کرنیں بکھیرتا کرسٹل... اُس نے کبھی اِس خوشی سے لطف نہیں اُٹھایا تھا۔ وہ ان بے دام چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے ہمیشہ محروم رہا تھا۔ اُس نے افسوس کیا اور پچھتایا اور ہاتھ ملتے ہوئے بچوں کے کمرے میں گیا۔ وہ ابھی تک غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ اُس کا سر بوجھل اور طبیعت کسلمند تھی۔ منہ کا ذائقہ بھی خراب تھا۔ یہ شاید اچانک جلد اُٹھنے کی وجہ سے تھا۔ اُس نے بچوں کی گری پڑی چیزوں کو محبت اور پیار بھرے ہاتھوں سے اُٹھایا۔ کچھ دیر ان کے لمس سے محظوظ ہوا پھر انہیں ٹھکانے پر رکھ دیا۔ بچوں کے خیال سے اس کا دل ایک بار پھر بھر آیا۔ اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ اسے لگا جیسے اس کے اور بچوں کے درمیان کوئی چیز حائل ہو گئی ہے اور اب وہ انہیں کبھی دیکھ نہ سکے گا... لیکن نہیں، ایسا نہیں ہو گا، کل وہ سب اس کے پاس ہوں گے اور وہ اس کو بالکل نیا آدمی پائیں گے۔

وہ مطمئن ہو کر مسکرایا۔

اُس نے ایک اچٹتی نظر کمرے پر ڈالی۔ چند ساعتوں میں اُس نے سارے کام نبٹا دیے تھے۔ اُس نے کلاک کی طرف دیکھا۔ اسے لگا جیسے وقت کی سوئی کسی ایک جگہ اٹک کر رہ گئی ہے اور اب بھی وہی وقت ہے جو کافی دیر پہلے تھا۔ شاید سوئی کسی جگہ اَٹک گئی تھی۔ اُس نے سوئی کو ہاتھ سے سیدھا کر کے چلا دیا۔

کلاک دوبارہ ٹک ٹک چلنے لگا۔ اب وہ مطمئن تھا مگر اندر سے اس کا دل بے حد رنجیدہ ہورہا تھا۔ اسے اپنی اداسی کی ٹھیک وجہ بھی معلوم نہیں تھی۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اُس نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا۔ ارے واہ لائسنس تو لیا ہی نہیں۔ وہ باہر نکلتے نکلتے مڑ کر کمرے میں واپس آیا۔ میز پر رکھی تصویر میں اس کا بچہ مسکرارہا تھا۔ وہ گم سم کچھ دیر تصویر کو دیکھتا رہا۔ اسے لگا جیسے اس کا بچہ اس سے کہیں بہت دور چلا گیا ہے۔ اُس نے سر کو جھٹکا۔ کتنے فضول فضول خیال اسے آرہے تھے۔ اُس نے دراز کھول کر لائسنس نکالا۔ سامنے دراز میں اس کی چیک بک پڑی تھی...صرف دو چیک باقی تھے۔ اُس نے بنا غور کیے دونوں پر اپنے دستخط کر دیے۔ اُس کے اعصاب قابو میں نہیں تھے۔ اُس نے سوچا بھول چوک کا امکان باقی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ بندہ بشر ہے، کچھ بھی ہوسکتا ہے...کچھ بھی۔ وہ اپنے بچوں کو کسی بھی قسم کی مشکلات میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے چیک بک ذرا نمایاں کر کے میز پر رکھ دی جہاں آسانی سے نظر پڑ سکتی تھی۔ اچانک ضرورت پڑ جائے تو چیز کو ڈھونڈنا کتنا مشکل اور گراں ہوتا ہے۔ کچھ دیگر ضروری کاغذات کی بھی اُس نے پڑتال کی۔ کچھ کوائف لکھے پھر انہیں فائل کے اندر ترتیب سے رکھ دیا۔ پھر اُس نے بلوں کی جانچ کی۔ جن بلوں کی ادائیگی اسی دن تھی ان کو جیب میں ڈال لیا تاکہ راستے میں ادائیگی کرتا جائے۔ اب وہاں مزید رُکے رہنے کا کوئی جواز باقی نہ رہا تھا۔ اب تو اسے ہر حالت میں روانہ ہونا تھا۔ اُس نے ایک ناقدانہ نگاہ کمرے پر ڈالی جیسے وہاں رُکے رہنے کا کوئی حیلہ بہانہ ڈھونڈ رہا ہو۔ اُس نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا۔ کچھ بھی کرنے کو نہ تھا مگر اس کے بوجھل قدم وہیں رُکے ہوئے تھے اور اُٹھائے نہ اُٹھتے تھے جیسے کوئی ذبیح اپنی ایڑیوں پر زمین کو روک لے اور آگے نہ بڑھے اور گلے میں گھٹتی کھنچتی رسی اُس کی ٹانگوں سے پہلے ہی جان نکال لے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ آگے کو گھسٹ رہا تھا۔ اُس نے آہستہ آہستہ گھر کے دروازے بند کرنا شروع کیے۔ وہ اس سحر سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ دروازے بند کرنے کے بعد اسے خیال آیا کہ سوئچ تو اون رہ گئے ہیں اور باہر کے گیٹ کی چابی بھی شاید اندر بھول آیا ہے۔ وہ اتنا بھلکڑ تو کبھی نہیں تھا۔ اُس نے سارے دروازے پھر سے کھول دیے۔ یوں کرنے میں وہ بالکل پریشان نہیں ہوا۔ سوئچ تو بند تھے اور چابی اُس کی جیب میں تھی۔ اُس نے ایک ایک کر کے سارے دروازے بند کیے۔ اب وہ بالکل تھک گیا

تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے بیٹھ گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا جیسے وہ خود کو پُرسکون کر رہا ہو۔ جلدی میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اب اُس نے کوئی غلطی نہیں کی تھی لیکن تبھی وہ قدرے چونکا۔ اُس نے ایک لمبا سانس کھینچا۔ یہ تو گیس کی بُو تھی۔ یقیناً جلدی میں گیس کا چولھا کھلا رہ گیا تھا۔ اُس نے دھڑا دھڑ سارے دروازے کھول دیے۔ خدانخواستہ آگ لگ سکتی تھی اس لیے دروازے کھولے بغیر چارہ نہ تھا۔ لیکن گیس تو بند تھی۔ آخر وہ کیا چاہتا تھا؟ کیوں یوں بدحواس ہو رہا تھا؟ وہ جتنی جلدی میں تھا اسی قدر اس سے تاخیر ہو رہی تھی۔ وہ تو جلد سے جلد فارغ ہونا چاہتا تھا مگر ذہن بالکل شل تھا اور اس سے سب کچھ اُلٹ پلٹ ہو رہا تھا۔

اب وہ باہر پورچ میں آ گیا تھا۔

یہ اس کا معمول تھا کہ وہ روز دو بار گیٹ کھولتا۔ صبح باہر جاتا اور شام کو واپس آتا۔ برسوں سے یونہی ہو رہا تھا لیکن آج اُس نے پہلی بار غور کیا کہ فرش کا چپس کالے اور لال رنگ کا تھا۔ یہ کلر سکیم خوشنما تھی۔ گھر کے اندر ایک چھوٹا سا چوکور گراسی پلاٹ بھی تھا جس کی گھاس تازہ کٹی ہوئی تھی اور پھولوں کی ہلکی خوشبو میں تازہ کٹی گھاس کی مہک بھی شامل ہو گئی تھی۔ اسے پودوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ کس قدر بے خبر رہا تھا... تقریباً ہر معاملے میں۔ یہ سب چیزیں آخر سالہا سال اس کی نظر سے کیسے اوجھل رہیں؟ یہ کیسے ممکن تھا؟ مگر ایسے ہی ہوا تھا۔ کیاریوں میں پھول کِھل رہے تھے۔ اس کی بیوی ایک باذوق عورت تھی۔ اُس نے پاؤں سے جوتے نکال دیے اور سبز گھاس پر ننگے پاؤں چلنے لگا۔ اسے ایک انوکھی خوشی کا احساس ہوا۔ اس معمولی حرکت میں کتنا سکون تھا۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ کبھی یوں سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی اور آج موقع ملا تھا تو وقت کم تھا... بہت کم۔ اسے تو فوراً وہاں پہنچنا تھا اور وہ خوامخواہ تاخیر کے سبب پیدا کر رہا تھا۔ آخر وہ کب تک یوں بے مطلب وقت ضائع کرتا رہے گا۔ اُس نے دوبارہ مردہ دلی سے جوتے پہنے تبھی اسے خیال آیا کہ باتھ روم کے دروازے کی لکڑی قدرے پھول گئی ہے اور دروازہ تھوڑا کھلا رہ جاتا ہے اور بچوں کے بیڈ روم کی ایک کھڑکی کا پیچ بھی ڈھیلا ہو چکا ہے، کیوں نہ لگے ہاتھوں یہ کام بھی کر دے۔ بچے آئیں گے تو خوش ہو جائیں گے اور بچوں کو خوش دیکھ کر اُسے کس قدر سکون اور اطمینان ملے گا، اس کی ساری بے چینی دور ہو جائے گی۔ اُس نے ایک بار پھر گھر کے دروازے کھول

دیے۔ اسے ایک چھپی سی خوشی محسوس ہوئی۔

اچانک بند دروازے کھول کر گھر کے اندر جانے میں بھی ایک اسرار ہے۔

تھوڑی سی تلاش کے بعد اُسے چند اوزار مل گئے اور وہ مرمت کے کام میں جُٹ گیا۔ وہ برسوں کے رُکے کاموں کو آج اسی وقت نبٹا دینا چاہتا تھا۔ آخر یہ کام اسی کو کرنے تھے۔ ان کاموں کے لیے اس کے بچے ابھی بہت چھوٹے تھے۔

اب وہ پھر باہر پورچ میں نکل آیا تھا۔ ایک بار پھر اُس نے سارے دروازوں کو بند کر دیا تھا۔ پورچ جنوری کی نرم گرم دھوپ سے بھرا ہوا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اُس کا دل چاہا کہ اپنے گھر کی اس پُر سکون دھوپ میں تھوڑی دیر کے لیے ستا لے... لیکن نہیں، اسے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی، مزید تاخیر کی گنجائش نہ تھی۔ اسے تو وہاں بہت جلد پہنچنا تھا۔ اس کے دماغ میں گھنٹی سی بج رہی تھی۔ وہ گیٹ کی طرف بڑھا۔ پھر اچانک رُک گیا۔ اُس نے دیکھا بیوی کی غیر موجودگی میں گملوں میں لگے پودے بالکل سوکھ رہے ہیں۔ یہ تو بہت معمولی سا کام تھا۔ اُس نے پائپ لگایا اور پودوں کو پانی دینا شروع کر دیا۔ لگے ہاتھوں اس نے پودوں کی کاٹ چھانٹ بھی کر دی۔ اس کی بیوی یقیناً بڑی سگھڑ اور باذوق خاتون تھی۔ اسے اب گہرا احساس ہو رہا تھا لیکن وہ اتنی خوبیوں والی عورت سے کچھ عرصہ سے الگ الگ اور کٹا کٹا سا رہ رہا تھا۔ ویسے تو یہ اس کی پرانی عادت تھی کہ وہ گھر میں اجنبیوں کی طرح رہتا تھا اسی لیے وہ گھر کی ہر چیز کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

کل رات کی تیز ہوا نے بوگن ویلا کی بیل کو قدرے نیچے گرا دیا تھا۔ وہ کافی نیچے کو لٹک آئی تھی۔ اس کی نظر بیل پر پڑی تو وہ رُک گیا۔ اُس نے سوچا اس بیل کو باندھنا ضروری تھا۔ بیل کو باندھنے کے لے ایک لمبی رسی درکار تھی۔ اب رسی کے لیے شاید اسے گھر کے سارے بند دروازے پھر سے کھولنے پڑیں۔ لیکن اسے بہت دیر ہو جائے گی۔ اُس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ اچانک اسے ایک سفید رسی نظر آ گئی۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ اس رسی کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے۔ وہ قدرے چونکا اور گھبرایا جیسے غیر متوقع طور پر کسی چیز کو کسی غیر معمولی جگہ پر دیکھ کر انسان گھبرا جائے۔ آخر یہ رسی یہاں کہاں سے آئی تھی؟ ویسے یہ اتنی حیرت کی بات بھی نہیں تھی کیونکہ اس کے لیے تو گھر کی ہر چیز انوکھی اور غیر معمولی تھی۔ اُس نے سوچا اچھا

ہوا رسی یہیں مل گئی ورنہ اسے دوبارہ اندر جانا پڑتا، ایک بار پھر سارے دروازے کھولنے اور بند کرنے پڑتے۔ بیل کو بھی یوں تو نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ ویسے دوبارہ اندر جانے کا خیال اُسے بُرا نہیں لگا، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اِس خیال سے اُسے ایک گونہ خوشی محسوس ہوئی جیسے وہ خود اندر جانے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ بند گھر کو اچانک کھول کر اندر جانے سے انسان کو ایک پُراسرار سی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ وہ بھی بند کمروں میں پڑی چیزوں کو ایک بار پھر دیکھنا چاہتا تھا مگر اُس نے اپنی اِس شدید خواہش کو دبا دیا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا، حالانکہ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے وقت کی سوئی کسی ایک مقام پر پہنچ کر رُک گئی ہے۔ اُس نے رسی کو بیل کے ساتھ باندھا۔ گھبراہٹ سے اُس کے ہاتھ بُری طرح کانپ رہے تھے۔ اس چھوٹے سے کام میں بھی اسے کافی دیر لگی۔ اب اس رسی کو جنگلے تک پہنچانا اور باندھنا تھا۔ یہ کام زیادہ مشکل نہیں تھا۔ بس اوپر چھت پر جا کر جنگلے کے ساتھ رسی کی گِرہ لگانا تھی۔ لیکن درحقیقت یہ کام آسانی سے ہونے والا نہیں تھا کیونکہ جنگلے تک پہنچنے کے لیے اسے پھر سے گھر کو کھولنا تھا کیونکہ سیڑھیاں اندر سے اوپر کو جاتی تھیں۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اب تو گھر کھولے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ بیل کو باندھنا اُس وقت اُس کے لیے ایک اہم اور ضروری مسئلہ بن گیا تھا۔ جیسے کسی نے اسے چیلنج کر دیا ہو۔ اب وہاں پہنچنے کا خیال ثانوی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اُس کے سر پر ایک ہی دُھن سوار تھی کہ وہ کِس طرح اوپر پہنچ کر رسی کو باندھے۔ اب وہ اس کام کو انجام دیے بغیر چین سے نہیں جی سکتا تھا۔ وہ بے چین، مضطرب اور گہری سوچ میں تھا۔ اُس کے قدم آہستہ آہستہ بند دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تبھی اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا... کسی سخت اور ٹھوس چیز کے ساتھ۔ وہ چونکا اور اُس نے ایک عجیب چیز دیکھی۔ یہ ایک لوہے کی سیڑھی تھی جو بیل کے پیچھے سے دیوار کے ساتھ اوپر جنگلے کی طرف جا رہی تھی۔ وہ متذبذب اور حیران ہوا اور اُسے چکر سا آ گیا۔ یہ ایک عجیب اور حیران کر دینے والی چیز تھی۔ آخر وہ اس جگہ کہاں سے آئی؟ کیسے آئی؟ کب آئی؟ کون لایا؟ اُس کا ذہن ماؤف اور سوچ بے کار ہوگئی۔ کچھ دیر گُم سُم سیڑھی کو دیکھتا رہا پھر اُس نے سوچا کہ شاید وہی گھر کے معاملوں سے دور، بے گانہ اور بے زار رہا ہو۔ یقیناً پچھلے دس برس سے، جب سے وہ اِس گھر میں رہ رہا تھا، یہ سیڑھی یہیں موجود ہوگی۔ یہ اُس کی غفلت تھی کہ اُس نے سیڑھی کی طرف کبھی کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ بے شک یہ حیران کُن بات تھی مگر

بات یوں ہی تھی۔ اُسے آج تک معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ایک سیڑھی اِدھر موجود ہے... بل کھاتی سیڑھی اوپر کو جاتی ہوئی، خوبصورت چمکدار کالی پالش شدہ لکڑی کی ریلنگ۔ یہ سیڑھی دیکھنے میں خوبصورت اور قیمتی تھی۔ وہ اندر سے کچھ حیران ہوا۔ اتنی قیمتی سیڑھی کو باہر بنوانے کا کیا مقصد تھا؟ اس سیڑھی میں ضرور کوئی بھید تھا۔

جب اُس نے سیڑھی کو چھوا تو اُسے خاصا ناگوار محسوس ہوا۔ خوبصورت ہونے کے باوجود اس میں کوئی چیز غیر معمولی اور پراسرار تھی۔ وہ چپ چاپ سیڑھی کو متوحش نظروں سے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ کچھ بھی ہو اس کی بیوی قابلِ صد ستائش تھی۔ اُس نے گھر کی تعمیر میں کہیں کوئی کمی نہیں رہنے دی تھی۔ گھر بناتے وقت گھر کی ہر ضرورت کا خیال رکھا گیا تھا۔ اب سیڑھی کو دیکھ لیجئے۔ کیسی غیر معمولی جگہ پر ایک انوکھی سیڑھی نصب تھی... کالے رنگ کی پالش میں جگر جگر کرتی، بل کھاتی، گھومتی، اوپر کو جاتی۔ اور اُس نے پہلے کبھی اس انوکھی چیز کو دیکھا ہی نہیں تھا حالانکہ وہ روز گیٹ کھول کر اس کے پاس سے ہی گزرتا تھا۔ مگر وہ ایک بے انتہا بے خبر آدمی تھا۔ اپنے ہی گھر میں وہ اجنبیوں کی طرح رہ رہا تھا۔

اُس نے بھی زندگی عجیب بے ڈھنگے پن سے گزاری تھی۔ بچوں کے لیے وہ اجنبی تھا اور بچوں کے قریب جا کر اُسے الجھن ہونے لگتی تھی اور وہ بے زاری سے کہتا:

''جاؤ بھئی جاؤ۔ تمہاری ماں اُدھر ہے۔'' بچے اُسے للچائی ہوئی محبت پاش نظروں سے دیکھا کرتے اور اُس کے قریب آنے کے لیے ترسا کرتے مگر وہ ان کی دلی کیفیات سے بالکل بے خبر تھا۔ شور و غل کرتے، چیزیں کھٹ کھٹ پھینکتے بچے اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ وہ ان سے بھی بلند آواز میں چیختا اور بچے سہم جاتے، دبک جاتے۔ وہ رات گئے گھر آتا اور سیدھا اپنے کمرے میں گھس جاتا۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر غصے میں آ جاتا، چلاتا اور چیزیں پٹختا، اپنا سر پھوڑنے لگتا۔ گھر کی کسی چیز کے ساتھ اسے لگاؤ نہیں تھا۔ وہ آئے دن چیزیں پھینک کر توڑ ڈالتا اور ذرہ برابر افسوس نہ کرتا۔ اُس نے بارہا دیکھا کہ اس کی بیوی ٹوٹی چیزوں کو ہاتھ میں لیے کتنی دیر تک مغموم اور گُم سُم سی بیٹھی رہتی۔ بیوی کا یہ روّیہ اُس کی سمجھ میں نہ آتا۔ وہ غصے سے گرجتا:

''چیز ٹوٹی ہے کوئی مر تو نہیں گیا۔''

اُسے چیزوں کو توڑنے پھوڑنے اور زور زور سے چلانے میں مزا آتا۔ بیوی بچے سہم کر رہ جاتے اور وہ اپنا بڑ پنا دِکھا کر مطمئن ہو جاتا۔ رات کو وہ بستر پر آرام سے لیٹ کر اخبار پڑھتا رہتا۔ اُس کی بیوی کام سے فارغ ہو کر اُس کے قریب آ کر لیٹ جاتی اور وقفوں وقفوں سے اُس کی طرف پُر اُمید نظروں سے دیکھتی ...شاید وہ متوجہ ہو اور کوئی بات کر سکے۔ کہنے سننے کو سو باتیں تھیں مگر وہ گونگوں کی طرح پڑی رہتی۔ وہ اخبار کے پیچھے سے اس کا جائزہ لیتا رہتا۔ ایک ہی چہرہ دیکھتے دیکھتے وہ بے زار ہو چکا تھا۔ پھر یوں بیوی کے مسکین پن سے وہ اور بھی چڑ جاتا۔ کئی بار وہ چیخ پڑتا:

''جاؤ اُدھر بچے کے بیڈ پر چلی جاؤ۔''

اُس کا بلا وجہ تنا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ خاموشی سے پلنگ سے نیچے اُتر جاتی۔ وقت لمبا ہو جاتا۔ وہ اکیلا بڑے پلنگ پر کروٹیں لیتا رہتا۔ اُس کی کمر دُکھنے لگتی، ہر چیز ساکن، منجمد اور بے جان نظر آتی۔ وقت ایک سناٹے اور بھاری پن سے گزرتا... رُک رُک کر، تھم تھم کر۔ اُس کی بیوی جلد سو جاتی اور ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگتی۔ خراٹوں کی آواز تیز ہو جاتی۔ وہ بڑی گہری نیند میں چلی جاتی۔ وہ لیٹے لیٹے اس کی طرف نفرت سے دیکھتا۔ خراٹے لیتے میں اُس کا منہ تھوڑا سا کھل جاتا۔ وہ اسے بھیانک لگتی۔

انسان کتنا بھی خوبصورت ہو بالآخر اُس کی خوبصورتی بھربھری مٹی کی طرح اُس کے وجود سے گرنے لگتی ہے۔

کبھی صبر شکن خاموشی کے بعد وہ اپنی بیوی کو ہلا دیتا:

''اُٹھو۔'' وہ سخت لہجے میں کہتا۔

اُس کی بیوی گہری نیند سے بیدار ہو جاتی۔ اُس کا منہ بند ہو جاتا اور خراٹے رُک جاتے۔ وہ اُس کی طرف پُر اُمید حیرت سے دیکھتی۔ تھکی تھکی، پیاسی اور نڈھال روح محبت کے چھینٹوں کو ترستی۔ شاید کوئی ایک لفظ، کوئی ایک بول۔

''شاید آپ نے بلایا۔''

''ہاں۔'' وہ بڑی بے رحمی سے ہنستا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کسی بے تعلق شخص کی طرح دیکھتا۔

''اچھا۔'' اُس کی بیوی بے یقینی سے کہتی

اور اُس کا ذہن اُسے شدید اذیت اور صدمہ پہنچانے کے حربے سوچتا۔

''کہیے۔'' اُس کی بیوی دبے لہجے میں کہتی۔

''تم یوں خراٹے لیتی بہت بھیانک لگ رہی تھیں۔ تمہارے کھلے منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔''

''نہیں تو۔'' اُس کی بیوی مارے شرمندگی کے مُرجھا سی جاتی اور اُس کی آنکھوں میں اس اذیت کو محسوس کر کے آنسو آ جاتے۔

گھر سے باہر بھی اس کا روّیہ کچھ ایسا ہی تھا۔ تنہا، اکیلا، دوست بھی کم تھے۔ وہ خود بھی دوسروں سے بالکل الگ تھلک سا رہتا تھا۔

کبھی کوئی دوسرا کہہ دیتا:

''چلو یار کہیں گھومنے چلیں... جلو پارک، فورٹرس یا قذافی۔ چلو چل کر میچ دیکھتے ہیں۔ ہاں، یہ ٹھیک ہے۔''

تو وہ صاف انکار کر دیتا:

''نہیں مزا نہیں آتا۔''

مگر دوستوں کے جانے کے بعد وہ فوراً تیار ہو کر انہی جگہوں پر پہنچ جاتا... بالکل اکیلا۔ ہجوم میں وہ نا آشنا چہروں کے درمیان دبکے انداز میں گزرتا۔ کئی بار وہ گہری تاریک راتوں میں کسی حادثے سے دوچار ہوتے ہوتے بچتا مگر اپنی ان عادتوں کو نہ چھوڑ سکا۔

مگر آج کا دن انوکھا تھا کہ وہ بالکل بدل گیا تھا، اور بدلے ہوئے انداز میں سوچ رہا تھا... ایک بالکل نارمل آدمی کی طرح جو عام فہم انداز میں نفرت بھی کرتا ہے اور محبت بھی، روتا بھی ہے اور ہنستا بھی ہے۔ وہ کبھی زندگی کے قریب سے نہیں گزرتا بلکہ خود کو زندگی کے اندر اور زندگی کو خود اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ وہ زندگی سے اپنا رشتہ مضبوطی سے جوڑے رکھتا ہے۔

اُس نے بڑی محبت اور اپنائیت سے اپنی بیوی کے بارے میں سوچا۔ وہ یقیناً بڑا خوش نصیب تھا جو اُسے ایسی خوبصورت، محبت کرنے والی، باشعور، سلیقہ مند بیوی ملی تھی۔ وہ اس پر جتنا بھی فخر کرتا کم تھا۔

وہ آہستہ آہستہ سیڑھی کی طرف بڑھا۔ کالی ریلنگ پر اُس نے ہاتھ رکھا۔ اُسے ریلنگ سے اپنی بیوی کی خوشبو آئی۔

''واہ!''

اُس نے نیچے سے اُوپر کی طرف دیکھا اور کچھ دیر دیکھتا رہا۔ اُسے یوں لگا جیسے سیڑھی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی اُوپر کو جاتی نظر آ رہی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا؟ شاید اُس کا وہم تھا۔ اُس نے اپنے سر کو جھٹکا... کہیں وہ دیوانہ تو نہیں ہو گیا۔ نہیں نہیں، وہ بالکل ہوش و حواس میں تھا۔ بھلا سیڑھی خلا میں تو کھڑی ہونے سے رہی۔ وہ بھی کیسے وہموں میں پڑا تھا۔

رسی کو پکڑ کر اُس نے سیڑھی پر اپنا پاؤں رکھا تو اُس کے اندر کچھ ناگواری سی پیدا ہوئی۔ اُسے اس سیڑھی پر چڑھنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اُس کے پاؤں بھی کچھ بوجھل سے ہو گئے تھے اور چڑھتے میں اُسے کوفت اور اَذیت کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ بارہا سیڑھیاں چڑھا بھی تھا اور اُترا بھی تھا لیکن اس سیڑھی پر چڑھتے ہوئے اُس پر عجیب اور غیر معمولی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اُس کے جسم پر سردی کی کپکپی تھی اور دل افسردہ اور بوجھل جیسے وہ کسی نہایت ہی ناگوار مرحلے سے گزر رہا ہو۔ اس کا دل خوامخواہ رونے کو چاہ رہا تھا۔ کوئی زبردستی نہیں تھی۔ وہ نیچے بھی جا سکتا تھا مگر یہ خیال اُس کے ذہن میں نہیں تھا۔ اُسے اوپر جانا تھا اور لازمی جانا تھا۔ وہ کچھ دیر رُکا کھڑا رہا۔ اُس نے بڑی بے ہمتی سے نیچے سے اوپر تک نگاہ ڈالی۔ اُسے لگا جیسے وقت کافی گزر چکا تھا مگر وہ ابھی تک اپنے بوجھل وجود کے ساتھ سیڑھی کے پہلے قدم پر ہی رُکا کھڑا تھا۔ آخر ایسی بھی کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو سمجھایا، دلاسا دیا، ہمت بندھائی، حوصلہ بڑھایا۔ ایک رسی ہی تو باندھنی تھی۔ اس میں آخر کتنا وقت لگے گا؟ شاید چند منٹ اور بس پھر وہ نیچے اُتر آئے گا اور کچھ دیر کے لیے اپنے گھر کی دھوپ میں ضرور ستائے گا۔ اُس کے اس کام سے اُس کی بیوی بہت خوش ہو گی۔ اچانک اُسے اپنے بیوی بچوں کا خیال شدت سے آیا۔ اس وقت وہ کہاں ہوں گے؟ کیا کر رہے ہوں گے؟ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ اس وقت، اس حال میں، اِس سیڑھی پر کھڑا ہو گا۔ اُن کے لیے تو یہ بات بہت غیر معمولی اور انوکھی ہو گی بلکہ شاید مضحکہ خیز بھی۔ وہ اپنے اوپر ہنسنے لگا۔ یہ بڑی دکھی ہنسی تھی کیونکہ ہنستے میں اُس کے آنسو نکل پڑے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ اُس کا دل بھر

آیا تھا۔ وہ چاہتا تھا وہیں بیٹھ جائے اور اپنے دل کی خوب بھڑاس نکالے۔

مگر آخر وہ کیوں رونا چاہتا تھا؟ اُسے معلوم نہیں تھا۔ پھر اُسے جانے کا خیال آیا۔ اُس خیال نے اُس کی ہمت بڑھائی۔ اُس نے سوچا تھوڑا سا آخری کام باقی ہے، ابھی چند منٹ بعد وہ فارغ ہوگا پھر اطمینان سے گھر سے نکل جائے گا۔

وہ آہستہ آہستہ گھومتا ہوا سیڑھی چڑھنے لگا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا وزن منوں بڑھ گیا تھا اور پاؤں سوج کر پھول گئے تھے۔ اُس کا سانس بھی اُکھڑ رہا تھا۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر آگے بڑھنے لگا۔ وہ تیز چل رہا تھا مگر اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بہت ہلکی رفتار سے تقریباً رینگتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ بل دار سیڑھیوں پر گھسٹتے ہوئے اُس نے سر اُٹھا کر اوپر دیکھا۔ اُس کے دل کو قدرے اطمینان ہوا۔ جنگلا قریب آ رہا تھا۔ وہ اندر سے بہت حیران ہوا اور ٹپٹایا۔ آخر اُس کی بیوی نے یہ پراسرار پیچیدہ سیڑھی کیوں اور کس لیے بنوائی تھی؟ بظاہر اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی سانس پھول گئی تھی۔ اُس نے ایک بار پھر سر اُٹھا کر دیکھا۔ جنگلا بالکل قریب تھا مگر سیڑھی پر شاید کوئی سایہ پڑ رہا تھا جو وہ نیم تاریکی میں بادلوں کی سی دھند میں آگے کو بڑھتی جا رہی تھی اور جنگلے سے ایک فاصلے پر سے گزر رہی تھی۔ وہ جنگلے کو پکڑ نہیں سکتا تھا۔ وہ چکرا کر رُک گیا۔ اُس نے واپس جانے کے خیال سے نیچے دیکھا۔ سنہری دھوپ میں پھیلی ہوئی سبز گھاس اُسے کنویں کے پیندے میں جمی کائی کی طرح دکھائی دی۔ اَب سب بے کار تھا۔ اُس کے بوجھل پاؤں اچانک بالکل ہلکے ہو گئے اور ان پر اُس کو قابو نہ رہا۔ اُس نے رُکنے کی کوشش کی مگر اُس کے پاؤں خود بخود آگے کو بڑھتے چلے گئے۔

اندھیرے کا سفر

کنکنا سا پانی تھا۔

نہ زیادہ گرم نہ بہت ٹھنڈا۔ بالکل آرام دہ۔

اور وہ ایک سُبک پن کے ساتھ آنکھیں موندے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑے نرم دیواروں کے بیچ میں کسی خوبصورت سنہری مچھلی کی طرح تیر رہا تھا۔

پانی کے نرم ہلکورے اسے جھولا سا جھلا رہے تھے۔

یہ ایک ہنڈولنا تھا۔ اور اس میں یوں مکمل سپردگی کے عالم میں ڈھیلے پن سے کسی تابع معمول کی مانند پڑے رہنا کتنا آرام دہ تھا۔ کسی سختی کا وہاں کوئی احساس نہیں تھا۔ اُس کے گرد محبت کا ایک ہالہ تھا، مخمل کی سی لطافت اور گداز پن لیے جیسے کسی نے اُسے روئی کے گالے میں نرمی، محبت اور حفاظت کے ساتھ لپیٹ رکھا ہو۔ یہ لمس اور احساس کی جگہ تھی جہاں آگہی کا واسطہ لمس ہی تھا۔

اس لمس میں ایک آواز تھی... مدھر رسیلی آواز... رگ رگ میں اُتر جانے والی آواز... محبت کی سرگوشی، جذبات سے بھرپور، سرشار کر دینے والی۔ ایک خوشبو، محبت اور شوق کی مہک۔ ایک آہٹ، ایک دھڑکن جو کسی کے بہت قریب ہونے کا، کسی کے بہت اپنا ہونے کا لطیف احساس دلاتی اور زندگی اس کے اندر لہریں لینے لگتی۔ ایک ہل چل مچ جاتی اور وہ جوش وخروش سے لبریز محبت کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتر جاتا اور اپنے محبّ کو دیکھنے، محسوس کرنے کی کوشش میں تیزی سے متحرک ہو جاتا۔ مسرت سے کلکاریاں مارتا، رکتا، چلتا اور جذبوں کی انتہائی شدت میں بے دم ہو جاتا۔ کوئی تھا... بہت قریب، بہت ہی اپنا سا، یوں جیسے وہ خود

اس کے وجود میں سمویا ہو، اسی کا ایک حصہ ہو...اُس کی سانس میں اُس کی سانس چلتی ہو اور اُس کی دھڑکن میں اُس کا دل دھڑکتا ہو۔ وہ اُسے دیکھنا چاہتا تھا مگر دونوں کے بیچ میں ایک غیر مرئی پردہ حائل تھا۔ شاید اسی لیے اُس کی تمام حسیات لمس کی سرگوشی میں سمٹ گئی تھیں۔ وہ اس لمس کی آواز کے لیے بے چین رہتا جو اتنی نرم اور ملائم تھی جیسے کانچ کو فاختہ کے نرم پَر سے چُھو دیا جائے۔ اُس کا رُواں رُواں مسرت وانبساط سے کانپنے لگتا۔ وہ بڑی وارفتگی سے اُس کی طرف کھنچتا بڑھتا۔

یہ اُس کے قریب تر ہونے اور اس کو پالینے کی دیوانی خواہش تھی یا شاید تکمیل کی بے صبر آرزو۔ یہ کیسی کشش تھی جو مقناطیس کی طرح اُسے اپنی طرف کھینچتی تھی؟ اور وہ خود سپردگی میں پانی کے اندر ہی اندر حرکت کرتا۔ اُس کی تلاش میں بے چینی اور اضطراب تھا۔ وہ کسی تشنہ لب کی طرح بے صبر ہو جاتا اور بے خودی میں اپنا سر اُونچا کرتا۔ اُسے دیکھنے کی خواہش میں وہ بے چین ہو جاتا۔ اُس کی نبض تیز چلتی اور دل زور سے دھڑکتا۔ پھر سرخوشی میں وہ کنکنے پانی میں کلکاریاں مارتا اور خوشی کے ملکوتی نغمے الاپتا۔ جذبات کی عمیق ترین گہرائیوں کو چُھو لینے والے لمس کا انتظار کرتا۔ ہر لمحے، ہر پل اُس کے وجود کا ہر مواُس کا منتظر رہتا۔ لمس کی یہ مدھر آواز کہاں سے آتی تھی؟ جیسے اُس کے اپنے ہی وجود کے کسی دوسرے انجانے حصے سے آتی... گویا اس کی اپنی ہی آواز جسے وہ سنتا تھا۔

اُس کے گلابی ہونٹ اکثر اُسے محسوس کر کے مسکرا دیتے۔ ہلکا سالمس جو تھوڑی دیر کے لیے اُس پر ٹھہرا رہتا۔ وہ خوشی سے کسمساتا۔ کبھی اسے محسوس ہوتا جیسے وہ کسی کے ساتھ محوِ سفر ہے...تھوڑی سی بے آرامی۔ وہ تھوڑا بے چین اور چوکنا ہو جاتا۔ ایک ہلکے سے خوف اور خطرے کو محسوس کر کے سنبھل جاتا، سمٹ جاتا۔ کچھ عجیب قسم کی واردات ہوتی۔ وہ فوراً نرم دیواروں سے چمٹ جاتا۔ تبھی اسے کوئی چھوتا ہوا محسوس ہوتا۔ چاندی کے گھنگھرو بج اُٹھتے۔ فاختہ اپنے ملائم پروں کو اپنی چونچ سے سنوارتی۔ وہ سنبھل جاتا۔ سارے اندیشے کہیں غائب ہو جاتے۔

خوشی اور تحفظ کا یہ لمحہ کتنا انمول اور انوکھا تھا۔

گلاب کی پنکھڑی جیسے نازک ہونٹ مسکرا پڑتے۔ اس لمس میں محبت کی جو گھلاوٹ تھی

اُسے وہ اپنے اندر اُترتا محسوس کرتا۔ اِک خوشی اور سکون سے وہ اپنا سر اس وجود کے ساتھ لگا دیتا۔

وہ کون تھا...؟ اُسے معلوم نہیں تھا۔

یہ ایک چھوٹی سی تنگ جگہ تھی جہاں صرف اندھیرا اور پانی تھا یا لمس کی پراسرار ریشمیں سرسراہٹ۔ وہ اس اندھیرے میں اپنی ابتدا و انتہا سے بے خبر عالم انبساط میں سکڑا سمٹا تکمیل کے مدارج میں تھا۔ اپنے ہی وجود کے کسی دوسرے حصّے کو پانے اور دیکھنے کی خواہش سے بھرپور، آنے والے لمحوں کا اسے کوئی ادراک نہیں تھا۔ اندھیرے کا یہ صبر آزما سفر ابھی کچھ باقی تھا۔ اور وہ ایک اَبدی سکون میں، تمام حسیّات و جزئیات کے ساتھ ایک مکمل سانس لیتا وجود، روشنی کا منتظر تھا، جب اچانک کنکنے آرام دہ پانی میں کچھ گدلاہٹ اور بھاری پن پیدا ہو گیا اور اس میں اسے اپنا سانس رُکتا محسوس ہوا۔

یہ نئی واردات اس کے فہم و ادراک سے بالا تھی۔ اُس نے صرف تکلیف اور اذیت محسوس کی۔ اُسے یوں لگا جیسے کوئی قوت بڑی بے رحمی سے اُسے ان نرم محفوظ دیواروں سے پرے کھینچ رہی ہے۔ اور وہ اس طاقت کے سامنے ایک بے وزن تنکے کی مانند بے بس و بے اختیار ہے۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے بے آب مچھلی کی طرح تڑپا۔ ایک ہلچل سی مچ گئی۔ پانی مزید گدلا اور بھاری ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگے، ہونٹ بھنچ گئے ...اور سانس اکھڑ گیا۔ وہ اس گھور اندھیرے میں بے بسی سے زندگی کے لیے چیخا مگر یہ جان کر دم بخود رہ گیا کہ اُس کے اندر کوئی آواز نہیں تھی۔ اُس نے اپنے کھنچتے گھٹتے بے قابو وجود کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا چاہے مگر اس کے ہاتھ پاؤں پانی کے غلاف میں بند تھے۔ وہ بالکل بے دست و پا تھا اور بے اختیار ایک سمت کو کھنچتا جا رہا تھا۔ اس نے بالکل لاچار ہو کر اپنا وجود ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اب وہ اس انجانی قوت کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ لمبے اُکھڑے سانس لے رہا تھا۔ تکلیف کی شدت سے اُس کی چھوٹی سی پیازی زبان ہونٹوں سے باہر آ گئی اور دہانہ نیم وا رہ گیا۔ کسی نے بڑی سفاکی سے اس کے وجود کو اس سے الگ کر دیا۔ وہ یکلخت نرم گرم پانی سے اوندھے منہ کسی یخ بستہ منجمد فضا میں جا گرا۔

O

ایک لمحے کے لیے اس کی سانس غائب ہو گئی تھی۔ جس طرح ابا جی نے ایک دن اللہ ہو کا ورد کرتے ہوئے سانس اندر کھینچی تو پھر واپس نہ آ سکی۔ مگر یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ نرم دل نرس اس کے بیڈ کے قریب کھڑی تھی۔ اُس نے جیسے ہی اس کی نیم وا آنکھوں کی درز میں کالی پتلی کو غائب اور سفید ڈھیلے کو باہر نکلتے دیکھا، اُس کے منہ سے بدحواسی میں چیخ نکل گئی...

''ڈاکٹر تزئین، ادھر آیئے!''

اور پہلے اس کے دونوں شانے پکڑ کر اسے جھنجھوڑا۔ پھر ایک ہاتھ سے اس کے دل کو مسلا اور ساتھ ساتھ دوسرے ہاتھ سے آکسیجن کے سلنڈر کو سنبھالا۔ تب تک ڈاکٹر تزئین اپنا چمڑے کا لبادہ اور خون آلود دستانے اُتار چکی تھی اور وہ ہاتھ دھو کر سفید براق تولیے کے ساتھ انہیں پونچھ رہی تھی جب نرس کی دیوانی چیخ اُسے سنائی دی۔ وہ فوراً پلٹ کر بیڈ کے پاس آئی اور اُس کے اوپر جھک گئی۔ تبھی اُس نے اپنی زرد بیمار آنکھیں کھول دیں۔ آنکھوں کی پلکوں پر ابھی تک آنسو اٹکے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے لیے اُسے کچھ بھی یاد نہیں آیا کہ وہ کون ہے؟ کہاں ہے؟ اور کس حال میں ہے؟ چند ساعت سکوت رہا پھر اُس کی ناک کے نتھنے پھڑکے۔ فضا میں تازہ خون کی بُو تھی۔ اُس کا تھکا ہوا ذہن بیدار ہو گیا۔ اُسے سب کچھ یاد آ گیا... سب کچھ۔ تب اُس کا دل چاہا کہ وہ جھٹکا مار کر اُٹھے اور اپنی پوری قوت سے چیختی چلاتی فریاد کرتی باہر بھاگ جائے۔ مگر اس کا جسم تکان سے بالکل بے سکت تھا۔ دونوں بازو دائیں بائیں بے جان لوتھڑوں کی مانند پڑے تھے۔ کمزوری سے گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی اور فرش پر خون آلود پاؤں کے اُدھورے نشان تھے... شاید بہت دیر ہو گئی تھی۔

''Murderer'' اُس کے ذہن میں ایک لفظ اُبھرا۔ اُس نے بولنا چاہا مگر اُس کے ہونٹ بھنچے رہے۔

اُسے یاد آیا جب وہ ساتھ والے کمرے سے اس کمرے تک آئی تھی، وہ اندر سے بہت کمزور اور مایوس تھی۔ پچھلے ایک دن سے رو رو کر اُس نے خود کو بالکل نڈھال اور پسپا کر لیا تھا۔ خوف اُس کے اندر بھرا ہوا تھا۔

ماں نے اُس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اپنی ٹھہری آواز میں کہا تھا:

''میری جان گھبراؤ نہیں۔ حوصلہ رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا'' اور اس نے اپنی شہادت کی انگلی اوپر اُٹھائی۔۔۔''وہ ہمارے ساتھ ہے۔''...

اور اس کے اندر ڈانواں ڈول ہوتا ایمان پھر سے پختہ ہوگیا تھا۔ شاید یونہی ہو اور خوشی کا لمحہ وقت سے پہلے آ گیا ہو...اُس نے اپنے اندر ایک ہلکی سی خوشی کو محسوس کیا تھا۔

کمرے کی فضا غیر مانوس تھی۔

دوائیوں کی بُو، آکسیجن کے سلنڈر، بیڈ پر پڑی سفید چادر اور سرخ کمبل، ڈرپ سٹینڈ، ہیٹر کی زرد روشنی، روئی، چمڑے کے لبادے...اُس نے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنا لباس تبدیل کیا اور ہسپتال کا پچھلی بندشوں والا کھلا سا لباس پہن لیا۔ اس ذرا سی تبدیلی نے کمرے کی فضا کو کچھ اور پُر اسرار اور معنی خیز بنا دیا۔ وہ پھر سے کمزور پڑنے لگی۔ اُس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ وہ رونا چاہتی تھی۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ کہیں نہ کہیں کوئی بھید ضرور تھا اور وہ اندھیرے میں تھی۔ اُس نے عاجزی سے ماں کی طرف دیکھا تھا۔ اُس وقت اُس نے محسوس کیا کہ وہ کانپ رہی تھی۔

نرس نے اُسے بیڈ پر لیٹنے میں مدد دی۔ تب گھُٹے دل کے ساتھ وہ رسمی طور پر مسکرائی۔ اندر سے وہ بالکل ڈھے چکی تھی۔

''ماں...میرے قریب ہی رہنا۔۔''

''ہاں بیٹا...''

ماں کی نظریں مسلسل اس پر گڑی تھیں۔ اُس کا چہرہ خاموش اور گھمبیر تھا اور اُس کے ہونٹ بڑے تواتر سے ہل رہے تھے۔ جب اُسے ڈرپ لگی تو اُس نے اوپر دیکھا۔ نرس اور ڈاکٹر کے درمیان ماں کا چہرہ نمایاں تھا۔ اُس کی فکر مند آنکھیں گیلی تھیں۔ شاید اُس کو بھی حوصلے کی شدید ضرورت تھی۔

''ماں! میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اُس نے بھیگے بھیگے لہجے میں کہا تھا۔

ماں نے بڑی شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

اُس کے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔ وہ تیسرا کلمہ پڑھ رہی تھی۔

''سب ٹھیک ہے نا، ماں؟'' اُس نے سرگوشی میں پوچھا تھا۔ اُسے کیسا وہم آ رہا تھا۔

ماں نے اثبات میں سر کو ہلایا اور اُس کے ریشمی پریشان بالوں کو سہلاتی رہی۔ اُس کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ نرس نے ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی تھی۔۔۔ اُس کی پریشان نظریں کبھی ماں اور کبھی ڈاکٹر کے چہرے پر ٹِک جاتی تھیں۔

ماں کے ہلتے ہونٹ اُس کے گرتے حوصلے کو سنبھالا دے رہے تھے۔

''Bravo...سب کچھ ٹھیک ہے مائی ڈیئر چائلڈ۔ پریشان نہ ہو۔ ہمت کرو... ایسا اکثر ہو جاتا ہے۔''

ڈاکٹر تزئین نے خود روئی سے اُس کے کندھے پر سپرٹ لگا کر انجیکشن دیا تھا۔

''اب تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔۔۔''

''اچھا!...'' اُس نے گھٹی آواز میں کہا اور چہرے پر بشاشت لانے کی کوشش کی تھی۔ ایک بار پھر وہ اندر سے کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ اُس کا دل بیٹھ رہا تھا۔ جانے کیا ہونے والا تھا۔ اُس نے اچانک اپنا ایک ہاتھ اپنے اوپر رکھا... وہ متحرک تھا... اُس کا ہاتھ بھی لرز رہا تھا۔ اُس کے پورے وجود پر خوف کی کپکپاہٹ تھی۔

کیا وہ اسے دیکھ سکے گی؟ وہ کیسا ہوگا؟ پریشانی کے بوجھ تلے اِس ہلکی پھلکی خوش آئند سوچ نے اُسے تھوڑا سا سکون دے دیا۔ وہ ہلکا سا مسکرائی اور گہرا سانس لے کر ماں کی طرف دیکھا۔ تبھی درد کی پہلی لہر اُٹھی اور اُس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ اُس نے گھبرا کر اپنا ہاتھ ماں کی طرف بڑھایا۔ ماں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں چھپا کر محبت سے اُسے چوما۔

''میری بچی! میری جان تم سدا سلامت رہو۔''

ماں نے دل کی گہرائی سے دعا دی تھی۔ ماں کی آنکھوں میں خوف تھا اور اُس کے ہلتے ہونٹ بے جان ہو رہے تھے۔

ماں کی آنکھوں میں خوف کیوں تھا؟ وہ ماں سے ایک گہری بات پوچھنا چاہتی تھی۔ اُس نے بھرائی آواز میں مشکل سے کہا تھا:

''ماں... وہ ... میرا مطلب ہے... وہ... یعنی اسے کوئی خطرہ تو نہیں؟ وہ تو ٹھیک ہے نا...؟'' اُس کی آواز آنسوؤں سے گھٹ گئی تھی۔ مگر تبھی نرس نے ماں کو باہر جانے کے لیے کہا... اور اُس کے سوال کا اُسے جواب نہیں ملا تھا۔

اُسے یاد آیا کہ درد کی لہریں آہستہ آہستہ تیز ہوتی گئی تھیں۔ درد کی ان لہروں میں وہ گھِر سی گئی تھی، کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ پیٹ کے بوجھ سے اُس کا دم گھٹنے لگا تھا اور وہ کرب سے تڑپنے لگی تھی۔ وہ چیخ رہی تھی۔ چیختے چیختے اُس کے حواس گُم ہو گئے تھے، گلا رُندھ گیا تھا اور زبان خشک تھی۔

اُس کی چیخوں سے سارے ہسپتال میں ایک سناٹا سا پھیل گیا۔ وارڈ کے ہر مریض کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی اور ہر ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھ گیا تھا۔ یہ دعا کا وقت تھا۔

اب یاد کرنے پر اُسے یاد آیا کہ جب ان دل دوز چیخوں کے درمیان اُسے ساتھ والے کمرے میں لایا گیا تھا تو اُس کے پاؤں میں خون تھا۔

یہ کِس کا خون تھا؟

وہ چیخ چیخ کر پوچھنا چاہتی تھی مگر درد کی شدت نے اُس کے حواس گُم کر دیے تھے۔ اُس کا جسم ٹھنڈے پسینے میں بھیگا ہوا تھا... اور پیٹ پتھر کی طرح بوجھل اور ساکت تھا۔ اُس نے ڈرپ والے بازو کو زور سے جھٹک کر ڈرپ گرانے کی کوشش کی مگر بے سُود۔ چار نرسوں نے اُسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ بے بسی سے وہ بچوں کی طرح سِسک پڑی... ''بچاؤ''... مگر اُس کی آواز کو کسی نے نہیں سُنا۔ آنسو اُس کی پلکوں پر منجمد ہو گئے اور اُس کی دردناک چیخیں خلا میں ساکت ہو گئیں۔ اُس کے بعد کیا ہوا، اُسے کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ درد کی شدید لہروں میں سب کچھ گڈمڈ ہو گیا تھا۔ بس اُسے اتنا یاد تھا کہ مسلسل چیخنے سے اس کا گلا بند ہو گیا تھا، اُس کے ہونٹ سوکھ کر تڑخ گئے تھے اور ہونٹوں کے کونے خون سے بھرے تھے... اُس کے ماؤف ہوتے ذہن میں اگر کوئی خیال تھا تو صرف اُس کا۔ نیم غنودگی میں اُس کا ہاتھ اپنے اوپر خود بخود آ گیا تھا، گویا اُسے سنبھالنے اور بچانے کی کوشش میں تھی... وہ ساکت تھا۔

تب بصیرت کی تیسری آنکھ اُس کے اندر کُھل گئی۔

خون... خون... Murder۔

اُس کی اکڑی خشک زبان سے یہ لفظ اس کے تڑخے ہونٹوں پر گرا اور بغیر سماعت کے فنا ہو گیا۔ لیکن اس کی بازگشت اب بھی، اس وقت بھی اُس کے ذہن میں تھی اور وہ اُسے سُن سکتی تھی۔

''نہیں، مائی ڈیئر چائلڈ، ایسا کچھ نہیں ہوا۔''

ڈاکٹر نے اُس کے اُوپر جھک کر نرمی سے کہا تھا جیسے اُس نے اس کے ذہن میں اَٹکے اُس لفظ کو پڑھ لیا ہو۔

''وہ کچھ نہیں تھا...اور تمہیں بچانے کے لیے ایسا کرنا بہت ضروری تھا۔''

اور وہ جو اُن کے درمیان ایک روحانی اور جذباتی واسطہ تھا، وہ لمس کی زبان میں محبت کی سرگوشیاں۔۔۔ وہ سب کیا تھا؟ اُس نے آنسوؤں سے دھندلائی آنکھوں سے ایک تاسف کے ساتھ ڈاکٹر تزئین کی طرف دیکھا۔

اتنا بڑا جھوٹ، اتنا بڑا فراڈ۔

ڈاکٹر نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔ جیسے وہ اُس کے دل کی آواز کو سُن رہی ہو۔

وہ مایوسی اور بے اعتمادی کے ساتھ اُس کی طرف دیکھتی رہی۔

نرس نے اپنا ہاتھ اُس کے بے ترتیب گیلے بالوں پر پھیرا۔

''تھینک گاڈ، تم زندہ ہو۔ تم بچ گئیں۔ تھینک گاڈ... جب تم نے آخری طویل چیخ ماری تو تمہاری ماں نے سجدے میں گر کر اللہ کا شکر ادا کیا اور تمہارا صدقہ اتارا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ تم نے نجات پالی اور اُس کی دعا قبول ہوئی۔''

اور میری دعا؟ وہ کیوں لوٹا دی گئی؟ وہ کیوں قبول نہ ہوئی؟

اُس کے ذہن میں پھر وہی لفظ اُبھرا مگر ادا نہ ہو سکا۔

''تمہیں اس وقت بالکل پُرسکون رہنا چاہیے... بالکل پُرسکون۔ بس اتنا سوچو کہ تم زندہ ہو اور یہی سب سے بڑی حقیقت ہے۔''

نرس اُس کے ہونٹوں سے جما ہوا خون صاف کر رہی تھی۔

اُس نے آہستہ سے اُس کے ہاتھ کو پرے ہٹا دیا۔

Murderer... قاتل... اُس کے ذہن میں اَٹکا ہوا لفظ پھر بولا مگر یہ آواز کسی نے نہیں سُنی۔ اُس نے اپنی دھندلائی ہوئی آنکھیں بند کر لیں۔

اب وہ کسی کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی... ماں کو بھی نہیں۔ اُس کے خلاف اِس سازش میں شاید ماں بھی شامل تھی۔

اُس نے آنکھیں بند کر لیں تو ڈاکٹر تزئین نے سکون کا سانس لیا... وہ اس کا سامنا کرنے سے گھبرا رہی تھی۔

پھر اُس نے چور نظروں سے سِنک کی طرف دیکھا اور اُس کی نظریں بے اختیار سِنک کے اندر پڑی تام چینی کی چلمچی پر چلی گئیں جس کے اندر سردیوں کی اس ٹھٹھرتی رات میں ایک ادھورا نامکمل وجود عریاں پڑا تھا۔

آنکھ اور اندھیرا

زندگی گویا لعنت کا ایک ایسا مقفل طوق بن کر گلے میں لٹک گئی تھی جس کی چابی کہیں کھو گئی ہو۔ نہ اتارے بنے نہ اُٹھائے بنے۔ عجب مصیبت تھی۔

گھر کی فضا سخت بیزار کن اور بور ہو گئی تھی۔ فرخندہ اکثر کھڑکی کے قریب کہنیاں ٹکائے اس کے بند کواڑوں کو گھورتی رہتی اور جب اُسے پورے طور پر یقین ہو جاتا کہ کھڑکی بند اور مقفل ہے تو اُسے اچانک کمرہ پہلے سے زیادہ تنگ اور گھٹا گھٹا محسوس ہونے لگتا۔ تب اُس کا جی چاہتا کہ بند کواڑ اور تنی ہوئی دیواروں کے ساتھ سر پھوڑ کر مر جائے، مگر اُسی وقت اُسے محسوس ہوتا کہ ابا اپنی سُرخ آنکھوں سے کواڑ کے ساتھ لگے اندر جھانک رہے ہیں۔ سردی کی ایک لہر اُس کی رگوں میں دوڑ جاتی۔ وہ پھریری لے کر دروازے کی طرف دیکھتی رہتی، اور جب اُسے یقین ہو جاتا کہ دروازے میں کوئی متنفس موجود نہیں، تو وہ ایک گھومتی سی نظر کمرے کے چاروں طرف ڈالتی۔

بشریٰ کی چارپائی اب بھی کھڑکی کے قریب جُوں کی توں پڑی تھی۔ اُسے یاد تھا جب پہلے پہل وہ اس گھر میں آ کر رہے تھے تو بشریٰ نے کیسے جبر سے اس سے یہ جگہ چھینی تھی، لیکن اب بُشریٰ کے چلے جانے کے بعد بھی وہ بشریٰ کی چارپائی کو وہاں سے ہٹا دینے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔ وہ خوفزدہ تھی کہیں کوئی اُسے بشریٰ جیسا نہ سمجھنے لگے۔ وہ بشریٰ نہیں تھی، فرخندہ تھی... سر سے پیر تک فرخندہ... اپنی اس الگ تھلگ شخصیت کو منوانے پر بضد۔ سردی کی ٹھٹھری اور برسات کی حابس راتوں میں بھی وہ اپنے اسی کونے میں سوتی، جہاں ہوا اور روشنی کا گزر تک نہ تھا اور بشریٰ کی چارپائی اسی اکڑ اور ڈھٹائی کے ساتھ وہاں پڑی تھی۔ ابا اور اماں کو بھی

اسے وہاں سے ہٹا دینے کا خیال نہیں آیا تھا۔ بستر کی چادر پڑے پڑے مٹیالی ہوگئی تھی۔ کئی بار اُس کا جی چاہا کہ وہ امّاں سے کہے بھلا اُسے دھویا کیوں نہیں جاتا۔ لیکن پھر وہ چپ رہی۔ اور بھی تو بہت سی ایسی باتیں تھیں جن کے بارے میں وہ چپ تھی...

مثلاً بشریٰ کی وہ تصویر جو ایک پرانی طرز کے فریم میں جڑی میز پر اُلٹی رکھی تھی۔ افوہ! بشریٰ بھی کس قدر آمرانہ خیالات کی مالک تھی۔ کمرے کی واحد میز کو اُس نے صرف اپنی تصویر کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ حالانکہ اس میز پر فرخندہ کا بھی بشریٰ جتنا ہی حق تھا لیکن اب بشریٰ کے جانے کے بعد بھی اس کی تصویر میز پر پہلے کی طرح قبضہ جمائے تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ایک دن ابا نے کمرے کا جائزہ گویا سونگھ سونگھ کر لیتے ہوئے اس تصویر کو اُلٹا کر دیا تھا اور اب فرخندہ کو تصویر میں بشریٰ کے بے نیاز چہرے پر پھیلی ہوئی باغیانہ سی مسکراہٹ نظر نہ آتی تھی۔

اس تصویر کے علاوہ ایک ریک بھی تھا۔ یہ بھی بشریٰ کی ملکیت تھا۔ اس شیلف میں اوپر تلے نہایت بے ترتیبی سے کتابیں، رسالے اور ناول ٹھنسے تھے۔ یہ ناول اور رسالے زیادہ تر وہ تھے جو کسی سے پڑھنے کے لیے مانگے گئے تھے اور پھر واپس نہ کیے گئے۔ کچھ کتابیں ان میں ایسی بھی تھیں جنھیں بشریٰ نے لائبریری سے نہایت چابکدستی سے اُڑایا تھا۔ اور چند ایک سستے قسم کے ناول اور سیکنڈ ہینڈ رسالے اُس نے بازار سے خریدے تھے۔ ان کتابوں میں خالص ادبی قسم کی کتابوں کے ساتھ فلمی رسائل بھی تھے۔ اُف توبہ کیسے گھناؤنے اشتہار ہوتے ہیں فلمی رسالوں میں۔ ابا کو جتنی چڑ تھی ایسی کتابوں اور رسالوں سے، اتنا ہی بشریٰ انھیں ٹھونس ٹھونس کر ریک میں رکھتی اور مزے لے لے کر پڑھتی۔ ابا کو سب معلوم تھا، مگر بشریٰ کا پیار جیسے قفل بن کر ان کے ہونٹوں پر لگ گیا تھا۔

بس یونہی کبھی اماں سے دبی زبان میں ذکر کر دیتے:

''یہ بشریٰ کتابیں خریدنے کے لیے اتنے پیسے کہاں سے لیتی ہے؟''

''میں کیا جانوں؟ باپ سے ہی لیتی ہوگی۔'' اماں پہلے ہی ابا کے بے جا لاڈ پیار سے جلی بیٹھی تھیں۔

''کچھ خودسر ہوگئی ہے۔'' ابا کا لہجہ اور دھیما ہو جاتا۔

''پیار میں بچہ بگڑتا ہی ہے۔ سنورتا نہ کبھی سُنا نہ دیکھا۔'' اماں دل کے پھپھولے

پھوڑے جاتیں۔

''آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی، ابھی بچپنا ہے نا۔'' ابا بات کے سنجیدہ پہلو سے کترانے کی کوشش کرتے تو اماں تڑخ کر جواب دیتیں:

''بچپنا تو اس کا ساری عمر نہ جائے گا۔ سیانے کہتے ہیں، لڑکا بگڑے گھر مانگے، لڑکی بگڑے بر مانگے، مگر آپ کو فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''ہشت! بیوقوف، جاہل، کچھ سوچتی ہی نہیں بکے چلی جاتی ہے۔'' ابا کی آنکھیں خون کبوتر ہو جاتیں۔ ان کی کڑک کے آگے اماں کی کیا ہستی۔ مگر وہ پھر بھی خاموش نہ ہوتیں۔

''توبہ ہے... جانے اس آدمی کو شادی کے نام سے اتنی چڑ اور نفرت کیوں ہے۔ لڑکیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔ یہ کوئی گھر رکھنے کی چیز تھوڑی ہیں۔''

''اُف! اُف جان کو آ جاتی ہو۔ آخر چاہتی کیا ہو۔ کسی دیوار سے اپنا سر پھوڑ کر مر جاؤں کہ لڑکی کو کسی کنوئیں میں دھکیل دُوں۔ کچھ مال پلّے ہو، کوئی مناسب رشتہ ہو تو بات بھی کروں۔''

ابا جیسے تھک ہار کر جواب دیتے۔

''رشتہ تو ڈھونڈنے ہی سے ملے گا۔'' اماں کہتیں۔

''غریبوں کو کون پوچھتا ہے۔ سب پیسے کے پیر ہیں۔ ہم غریبوں کو تو خُدا بھی ڈھونڈے بغیر نہیں ملتا۔''

''تو پھر تم اپنے جیسا گھر ڈھونڈو۔ لڑکا پڑھا لکھا ہو۔ بات پکی کر چھوڑیں۔ اگلے سال شادی ہو جائے۔''

''افوہ! تم سے تو بات کرنا مصیبت مول لینا ہے۔ ایک دفعہ کہہ جو دیا، ہو جائے گا سب کچھ۔ اب کچھ نہ بولنا۔'' ابا کے سرد لہجے سے اماں کا جوش بھی ٹھنڈا پڑ جاتا۔

دونوں خاموش ہو جاتے۔

اور فرخندہ سوچتی رہ جاتی۔ واقعی ابا کو شادی کے نام سے اتنی چڑ کیوں ہے۔ دو سال بیت گئے۔ اماں کی ہر کوشش ابا کی سرد مہری کے آگے پانی کا بلبلہ بنتی رہی۔ بشریٰ ایک دفعہ بی اے میں فیل ہو کر پھر اس کی تیاری میں مشغول تھی۔ اب اُس نے اماں کی ان کوششوں میں

دلچسپی لینا بالکل چھوڑ دیا تھا۔
اب اس سلسلے میں کوئی عورت ان کے ہاں آتی اور اماں اسے اندر جانے کو کہتیں تو وہ فوراً رکھاوٹ سے جواب دیتی:
''فرخندہ کو دکھا دیجئے۔ میں نہیں جاؤں گی۔''
''کیوں؟'' اماں تیکھی ہو کر پُوچھتیں۔
''میں فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' بشریٰ فیصلہ کُن لہجہ میں جواب دیتی۔ ''بی ٹی کر کے میرا ارادہ سروس کرنے کا ہے۔''
اماں بے چاری عجب مصیبت میں پھنس گئی تھیں۔ ایک طرف ابا اُن کے کاموں میں روڑے اٹکا رہے تھے دوسری طرف صاحبزادی اکڑ بیٹھی تھیں۔
ابا بشریٰ کی باتیں سنتے اور چُپ رہتے۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ ابا کو بشریٰ پہلے سے زیادہ عزیز ہو گئی تھی۔ بشریٰ بشریٰ کرتے ان کا منہ سوکھتا۔ باہر سے جب بھی آتے بشریٰ کے لیے ضرور کچھ لاتے۔ یوں لگتا تھا جیسے بشریٰ کے ارادوں سے ابا خوش تھے۔
لیکن یہ تو صرف فرخندہ کو معلوم تھا کہ بشریٰ کے ارادے کیا تھے۔ دو سال کے اس ناٹک نے جو ابا اور اماں اس کی شادی کے بارے میں کھیلتے رہے تھے، اس کے اندر کون سے نئے جذبے کو بیدار کر دیا تھا اور اب وہ کیوں اس بات میں دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔
وہ بشریٰ کی راز دان نہ ہوتے ہوئے بھی اُس کی راز دان تھی۔ دوسرے معاملات کی طرح بشریٰ نے یہاں بھی دھاندلی سے کام لیا تھا اور بغیر ایک لفظ کہے یا اس کی خواہش اور رائے کا خیال کیے، اسے اپنے اعتماد میں لے لیا تھا۔
راستہ چلتے ہوئے جب وہ اچانک اُس سے کہتی ''فرخندہ آج میں گھر دیر سے آؤں گی۔ اماں سے کہہ دینا، ڈگری کلاس کا کوئی فنکشن ہے۔'' تو فرخندہ کچھ جواب نہ دیتی، لیکن گھر پہنچ کر اماں کے استفسار پر چپکے سے بشریٰ کے الفاظ دہرا دیتی۔
اماں سُن کر چپ کی چپ رہ جاتیں۔ ابا کے چہرے کا رنگ بھی ایک لحظہ کے لیے مٹیالا ہو جاتا، لیکن پھر وہ سنبھل کر کہتے:
''کالجوں میں یہی تو مصیبت ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی فنکشن۔ پڑھائی کم اور فنکشن

زیادہ۔تم بھی فرخندہ اُس کے ساتھ رُک جاتیں۔اب وہ اکیلی آئے گی۔اچھا میں جا کر لے آؤں گا۔'' اور فرخندہ ایک دم گھبرا کر کہتی:

''اِدھر آنے والی بہت سی لڑکیاں ہیں۔خود ہی آ جائے گی اُن کے ساتھ۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' ابا کے گرتے وجود کو جیسے سہارا مل جاتا۔

''کسی دن سر پر ہاتھ رکھ کر روؤ گے۔'' اماں تلخی سے کہتیں۔

''تم تو یونہی بکتی رہتی ہو۔'' ابا ناگواری سے جواب دے کر خاموش ہو جاتے اور فرخندہ کو یوں لگتا جیسے ابا سب کچھ جانتے ہیں۔ بشریٰ نے ابا پر بھی دھونس جما کر انہیں اپنا راز داں بنا لیا ہے۔

تب وہ اپنے چھوٹے سے کمرے میں آ جاتی۔ یہ کمرہ اس کے اور بشریٰ کے لیے وقف تھا۔ چپکے سے کمرے کی تنہا کھڑکی کھول کر وہ جُھٹ پٹے میں جھانکتی۔ لمبی گردن والے بگلوں کی ایک قطار پر پھڑ پھڑاتی اُفق کی گہرائیوں میں اُتر جاتی اور وہ سوچتی اس وقت بشریٰ، اخلاق کے ساتھ کس سینما ہاؤس میں بیٹھی فلم دیکھ رہی ہو گی۔ اخلاق اُسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، حالانکہ اُس نے اسے صرف دور سے دیکھا تھا اور وہ بھی چند ایک بار۔ لیکن اُسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس کے بارے میں سب کچھ جان چکی ہے۔

اُسے افسوس تھا کہ بشریٰ، اخلاق کو نہیں سمجھ سکی تھی۔ لیکن وہ خود اکثر سوچتی رہتی، بشریٰ کے پاس جو اونچے اور خوبصورت خواب ہیں، اخلاق ان کی تعبیر نہیں بن سکتا۔ بشریٰ اس چھوٹے سے گھٹے ہوئے ماحول سے نکل کر کھلی فضا میں پرواز کرنا چاہتی ہے۔ اسے حرارت سے بھرپور ہمہماتی لرزتی پھڑکتی زندگی چاہیے۔ اسے اُجالوں سے محبت ہے۔ اُس کے خواب بہت خوبصورت اور بہت قیمتی ہیں اور اخلاق انہیں پورا نہیں کر سکتا۔ کئی بار اُس کا جی چاہتا کہ بشریٰ کو سمجھائے، لیکن وہ جانتی تھی کہ بشریٰ ایک تحقیر آمیز تبسم کے ساتھ اُس کے مشورے کو ٹھکرا دے گی۔ بشریٰ بہت زیادہ جذباتی تھی اور اخلاق کے بارے میں تو وہ انتہائی شدت پسند ثابت ہو رہی تھی۔ وہ خاموش رہی اور اسی خاموشی میں وہ کالی اور بھیانک رات آ گئی جو اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

ٹک ٹک کرتے چھوٹے سے ٹائم پیس نے ابھی بارہ بجائے تھے اور وہ ہاتھ میں

کاغذ کا چھوٹا سا پُرزہ لیے کواڑ کے سہارے کھڑی کانپے جا رہی تھی اور روئے جا رہی تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ سامنے سیڑھیوں کا کھلا منہ کسی اژدہے کے کُھلے تاریک منہ کی طرح نظر آ رہا تھا اور ابھی ابھی بشریٰ اس تیز نوکیلے چبا جانے والے دانتوں کی قطاروں کے درمیان بنے ہوئے تاریک راستے پر خوشی کے ہلکے ہلکے قدم اُٹھاتی چلی گئی تھی...

کیوں...؟ بشریٰ کو تو اُجالوں سے پیار تھا۔ پھر وہ کیوں اس اندھیرے غار میں اُتر گئی تھی۔ کیا روشنی پانے کے لیے تاریکی سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ کانپ کانپ کر روئے جا رہی تھی اور اُس کی بھیگی مٹھی میں کاغذ کا پُرزہ بھی اُس کے ساتھ لرز رہا تھا۔ بشریٰ نے اُس کی مرضی کے خلاف اس پر اعتماد کر کے اسے ایک بڑی اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مجرم خیال کر رہی تھی۔ آخر اُس نے یہ سب کچھ اُس سے چھپ کر کیوں نہیں کیا۔ ایک بار اُس کا جی چاہا وہ بشریٰ کے اعتماد کو ٹھکرا دے اور ابھی چیخ چیخ کر اس کا بھید فاش کر دے۔ مگر پھر اُس کی وہی اَزلی بزدلی آڑے آئی۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔

چبوترے کے پاس ابا چارپائی پر گہری نیند میں مدہوش تھے۔ اندھیرے کے باوجود اُس نے اپنی بھیگی بھیگی آنکھوں کے ساتھ ابا کے کسی خوفزدہ بچے کے سے معصوم اور بھولے چہرے کی طرف دیکھا اور اُسے اُن پر بڑا ترس آیا۔ صبح اس چہرے پر موت کی زردی کھنڈ جائے گی۔ اُس کا سینہ جیسے غم سے پھٹنے لگا۔ اُس نے ابا سے نظریں ہٹا کر اماں کی طرف دیکھا۔ صبح یہ چہرہ بھی غم سے سُت جائے گا۔ اور آنسو بے اختیار اُس کے گالوں پر بہنے لگے۔ تبھی اماں نے کروٹ لی۔ وہ جلدی سے کواڑ چھوڑ کر اپنے بستر میں دبک گئی۔ اُس کی ماں نے ذرا سا سر اونچا کیا۔ دائیں طرف تھوک کر اُس نے بائیں طرف کروٹ لی اور بڑبڑانے کے لہجہ میں کلمہ اور آیۃ الکرسی پڑھنے لگی۔ اُن کے منہ سے یہ بھی نکلا ''بشریٰ آ گئی؟'' اُس کے بعد وہ پھر اُونگھ گئیں۔ فرخندہ نے سوچا شاید ماں نے کوئی بھیانک سپنا دیکھا ہے۔ اُس کا دل خوف سے کانپنے لگا۔ دور کسی اُجاڑ سے اُلو کے چیخنے کی آواز آئی اور اندھیرے میں دو تین چمگادڑیں ایک دوسری پر جھپٹے چلی گئیں۔ ساری رات وہ ایک ٹک کبھی اماں کبھی ابا اور کبھی اژدھے کے تاریک منہ کی طرف دیکھتی رہی۔

صبح اماں نے اُسے آواز دی تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ اُس پر گہری افسردگی طاری تھی

اور دل و دماغ بوجھل ہو رہے تھے۔ ماں اسے ابا کو جگانے اور بشریٰ کو اُوپر سے بُلانے کا کہہ کر کچن میں چلی گئی تھی اور وہ حیرت میں ڈوبی اپنی چارپائی پر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ ابا کو تو وہ جگا دے گی مگر بشریٰ کو وہ کہاں سے لائے گی۔ بشریٰ جو وہم کی طرح ہر جگہ تھی بھی اور نہیں بھی تھی۔ ماں کی دوسری آواز پر وہ مجبوراً اُٹھی اور کوٹھے کی سیڑھیوں پر زور سے پاؤں مارتی اُوپر گئی اور سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اُس نے بڑی دل گرفتگی سے دُعا مانگی:

''اے خدا بشریٰ اوپر ہو۔'' لیکن بشریٰ اوپر نہیں تھی۔ وہ آہستگی سے نیچے اُتری۔

''بشریٰ اوپر نہیں ہے۔'' ماں کو یہ اطلاع دیتے وقت اُسے آواز کو حلق سے کھینچ کر نکالنا پڑا۔

''اوپر نہیں ہے؟'' ماں کے ہاتھ سے کیتلی چھوٹ کر زمین پر آ رہی۔

''غسل خانے میں دیکھو۔'' اور پھر اُسے غسل خانے کے علاوہ گھر کا کونہ کونہ دیکھنا پڑا، لیکن بشریٰ کی آگے آگے بھاگتی ہوئی پرچھائیں کو وہ گھر کے کسی کونے سے نہ پکڑ سکی۔ تب ماں سر میں خاک ڈالتی دو ہتڑ پیٹتی کچن سے باہر نکلی اور صحن میں پہنچ کر دھڑ سے زمین پر کٹے ہوئے درخت کی طرح گر پڑی۔ ابا اچانک سوتے سے جاگ پڑے۔ انہوں نے اپنی سرخ اور ادھ مچی آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھا اور پھر گھبرا کر اُٹھ بیٹھے۔

''ہیں ہیں! کیا ہوا تمہیں۔'' پھر انہوں نے روتی ہوئی فرخندہ کی طرف دیکھا۔ پھر بوکھلا کر سوال کیا۔ ''بشریٰ کہاں ہے؟'' یہ سوال اس طرح کیا گیا تھا، جیسے خطرے کی لال بتی وہ بہت پہلے کی دیکھ چکے ہوں۔

بشریٰ کے جانے کے بعد گھر کی فضا یکسر بدل گئی تھی۔ گھر پر ہر وقت ایک سوگوار سناٹا چھایا رہتا۔ ابا اور اماں اپنے ستے ہوئے بے رونق چہروں کے ساتھ گھر میں سایوں کی طرح چلتے پھرتے... کھوئے ہوئے، گُم سُم اور خاموش... ایک دوسرے سے بیزار اور جھلائے ہوئے... اب وہ کبھی کسی معاملے میں ایک دوسرے سے متفق نہ ہوتے۔ اماں کو دیکھ کر ابا کی آنکھوں میں خون اُتر آتا اور اماں کے ماتھے پر بھی لاتعداد شکنیں پڑ جاتیں اور ان کے نتھنے پھڑکنے لگتے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کو کوئی الزام دینا چاہتے ہیں، ایک دوسرے سے جی بھر کر لڑنا چاہتے ہیں مگر پھر وہ خاموش کے خاموش رہ جاتے ہیں۔ اور فرخندہ سوچتی،

آخر یہ ایک دفعہ کھل کر ایک دوسرے سے لڑ کیوں نہیں لیتے۔ اس طرح دل کی بھڑاس نکل جائے تو گھر کی مکدر فضا میں شاید کوئی خوشگوار تبدیلی آ جائے۔ لیکن فضا کے تکدر میں تو اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

ایک دن فرخندہ کو کالج سے آنے میں دیر ہو گئی۔ جب وہ آئی تو ابا اور اماں اپنے اپنے طور پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی ابا نے کڑے لہجہ میں پوچھا:

''اتنی دیر کہاں رہی۔''

''بس بگڑ گئی تھی۔'' یہ مختصر سا جواب دے کر وہ جلدی سے کمرے میں آ گئی۔ اُسے ابا کا لب و لہجہ اور یوں سوال کرنا سخت ناگوار گزرا تھا اور سب سے زیادہ تو اُسے یہ بات ناگوار گزری تھی کہ ابا کی بات سُن کر اماں کی پیشانی کی شکنیں غائب ہو گئی تھیں اور ان کے چہرے کی نرماہٹ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ کم از کم اِس معاملے میں ابا کی طرف دار ہیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد ابا کمرے میں آئے۔ انہوں نے اس کمرے بلکہ اس گھر کی واحد کھڑکی کو دھڑ سے بند کر کے قفل لگا دیا۔

''ابا!'' اُس کا دم گھٹ کر رہ گیا۔ اُسے یوں لگا جیسے ابا نے اُسے جیتے جی قبر میں گاڑ کر اُس پر مٹی کی موٹی تہیں جما دی ہوں۔ اس سے پہلے خواہ کھڑکی کھلی رہتی تھی یا بند، اُس نے اس پر کبھی توجہ نہ دی تھی۔ لیکن اب کھڑکی بند ہو کر اُس کے حواس پر چھا گئی تھی۔ وہی کمرہ جس میں وہ پہروں بیٹھی رہا کرتی تھی اب اس کمرے میں اُسے ایک لمحے کا سکون نہ تھا۔ جب بھی وہاں بیٹھتی اور پڑھنے کے لیے کتابیں کھولتی تو بند کھڑکی کے کواڑ ایک دم اُس کی آنکھوں اور کتاب کے صفحات کے درمیان حائل ہو جاتے۔ دوسری طرف اماں نے بھی کمرے کے اندر پلنگڑی ڈال کر اس کے پاس بیٹھنا شروع کر دیا۔ وہ گھبرا کر صحن میں نکل آتی یا کوٹھے پر چڑھ جاتی تو اماں بھی کسی نہ کسی بہانے وہاں کے چکر لگاتی رہتیں۔ وہ بشریٰ نہیں تھی، پھر بھی اُسے بشریٰ سمجھا جا رہا تھا۔ ان حالات میں وہ عجب گھٹن اور بے بسی محسوس کر رہی تھی۔ بعض اوقات اُسے یوں محسوس ہوتا۔ جیسے کوئی اُسے بشریٰ بن جانے پر اُکسا رہا ہے۔ وہ کیوں نہ بشریٰ بن جائے۔ لیکن پھر وہ ان خیالات کو فوراً اپنے ذہن سے جھٹک دیتی... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس میں اور بشریٰ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ریک میں پڑی بے ترتیب کتابوں کو دیکھ کر اکثر وہ اپنے

دل میں بشریٰ کے لیے نفرت محسوس کرتی۔ عجب جذباتی، لاپروا، متلون مزاج اور اُلجھے ہوئے خیالات کی مالک لڑکی تھی۔ کئی بار اُسے بشریٰ پر غصہ بھی آیا۔ اُس کے کیے کی سزا وہ بھگت رہی تھی۔ ابا اور اماں نے کڑی نگرانی کے لیے نظروں کے چار چوکیدار اُس پر بٹھا دیئے تھے۔

صبح ابا سائیکل پر اُسے کالج چھوڑنے جاتے، پھر سائیکل پر ہی وہ کالج سے واپس آتی۔ اِس پر بھی وہ صاف دیکھ رہی تھی کہ ابا اور اماں اُس سے غیر مطمئن رہتے ہیں اور وہ ان کا رویّہ دیکھ کر چور سی بنتی جا رہی تھی اور اُس کی ذہنیت مجرمانہ سی ہوتی جا رہی تھی۔

کبھی کالج سے آتے یا جاتے وقت کوئی نوجوان سائیکل کے پیچھے لگ جاتا اور ابا مضطربانہ مڑ مڑ کر، گھور گھور کر اُسے دیکھتے تو اُس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگتے۔ اُسے یوں لگتا جیسے ابا نوجوان کے قریب چلنے کو بھی اسی کا قصور سمجھ رہے ہیں۔ اگر ایسے لمحے طویل ہو جاتے تو وہ بالکل نروس ہو جاتی۔ بعض اوقات تو اُسے محسوس ہوتا جیسے اُسے ہپناٹائز کیا جا رہا ہے۔ اُسے سمجھایا جا رہا ہے کہ وہ بھی بشریٰ ہے اور اُسے اپنے جرم کا اقرار کر لینا چاہیے۔ بعض اوقات تو یہ احساس اتنا شدید ہوتا کہ اُسے یوں لگتا جیسے کسی غیبی طاقت کے زیرِ اثر وہ ابھی اپنا نقاب اُلٹ دے گی اور صاف صاف کہہ دے گی۔ ''میں اُس لڑکے کو جانتی ہوں۔ مجھے اُس سے محبت ہے اور میں نے آج آدھی رات کو اُس کے ساتھ بھاگ جانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔'' لیکن یہاں پھر اُس کے شعور کی پختگی کام آتی اور وہ ایک دم سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر خود کو سنبھال لیتی۔

شروع شروع میں یہ مخدوش حالات اُس کے ذہنی قویٰ کو مضمحل اور مفلوج بناتے رہے۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ ان حالات کی خوگر ہو گئی۔ اب کبھی وہ دبی زبان سے کوئی فرمائش کرتی اور اماں بے دردی سے جواب میں کہتیں:

''بس بس! اب فرمائش پوری کرنے کا بوتا نہیں رہا۔ ایک کے بہت چاؤ لاڈ کر کے دیکھ لیا۔'' یہ باتیں اُسے ناگوار نہ گزرتیں۔ مگر یہ بات اُسے سخت ناگوار گزرتی کہ اُسے ہر قدم پر بشریٰ کے برابر کھڑا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

کچھوے کی سی سُست رفتاری سے دن رات گزرنے لگے اور پھر ایک مدت بعد اُس نے گھر کی خاموش اور ساکن فضا میں ایک ہلکی سی ہلچل محسوس کی۔

اُس دن کچھ اجنبی عورتیں گھر میں آئی تھیں اور ابا عین موقعہ پر سائیکل اُٹھا کر کہیں غائب ہو گئے تھے۔۔۔۔ شام کو جب وہ لوٹ کر آئے تو اماں خون کے گھونٹ پیے ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ کھانا نکالتے نکالتے وہ ایک دم برس پڑیں۔

''کہاں چلے گئے تھے آپ؟'' انہوں نے وکیلانہ جرح کی۔

''کیوں کیا کوئی ضروری کام تھا؟'' ابا نے معصومیت سے پوچھا۔

''کہا جو تھا آج کچھ عورتیں آ رہی ہیں، آپ کہیں نہ جائیں''۔

اماں نے جل کر جواب دیا۔

''عورتوں سے میرا کیا کام!'' ابا بھولے بن رہے تھے۔

''عقلمند کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے اور بے وقوف منہ کے بل گر کر بھی ہوشیار نہیں ہوتا۔'' اماں نے طنز کی تو ابا ایک دم بھڑک اُٹھے:

''پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو، سیدھی طرح بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو۔''

''میں کیا کہوں گی؟ دنیا کہتی ہے کہ اس آدمی نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ لیکن اتنا یاد رکھو فرخندہ کو میں اس کنوئیں میں نہ گرنے دوں گی اور تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔''

''اپنی اولاد کا بُرا کون چاہتا ہے۔ تم سے زیادہ مجھے فکر ہے۔ مگر پیسہ کہاں سے آئے گا۔''

''رشتہ طے ہو جائے تو پیسے کا بھی انتظام کر لیں گے۔ ہماری کون سی دس اولادیں بیٹھی ہیں۔ ایک اکیلی لڑکی کو بھی بیاہ نہیں سکتے۔''

ابا خاموش ہو رہے۔ لیکن اس کے بعد ابا اور اماں کے درمیان اکثر جھڑپیں ہونے لگیں اور وہ سمجھ گئی، آج سے دو سال پہلے کا ناٹک دھرایا جا رہا ہے۔ وہ اپنے اسی چھوٹے سے بند کھڑکی والے کمرے میں بیٹھی سب کچھ دیکھتی اور سنتی رہی۔ نت نئی عورتیں آتیں اور اُسے بکاؤ مال کی طرح دکھایا جاتا۔ پھر بھاؤ تاؤ ہوتا اور آخر میں تان ابا پر ٹوٹتی جو عین موقعوں پر کہیں غائب ہو جاتے۔ اُسے نہ ابا پر غصہ تھا، نہ اماں سے شکایت... وہ بشریٰ نہیں تھی فرخندہ تھی... ایک خاموش تماشائی۔

اور پھر یوں ہوا کہ اماں کی دو سال کی کوششیں رنگ لائیں۔ اُس کی منگنی ہوگئی۔ ڈاکٹر

احمد ایک اُونچے قد کا خوب صورت جوان تھا۔ فرخندہ کی قسمت پر ہر کسی کو رشک آ رہا تھا۔ اور ایسی قسمت پر رشک آنا ہی چاہیے۔ ابا جو کل تک سرد مہری کا اظہار کرنے پر تلے ہوئے تھے، شادی کے دن کو قریب آتا دیکھ کر وہ بھی سستی جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ چیزوں کی خرید وفروخت میں جو صبح گھر سے نکلتے تو شام ہی کو واپس آتے۔ اماں نے سو جوڑ توڑ سے اچھا خاصا اپنی بساط سے بڑھ کر جہیز تیار کر لیا تھا۔ صبح سے شام تک چیزیں ڈھوتے ابا کی کمر دُہری ہو جاتی۔ شام کو تھک ہار کر بیٹھتے تو یا تو کسی نہ کسی بہانے سے اماں سے جھگڑنے لگتے یا پھر بیٹھے یوں ہی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتے۔ ان دو چار برسوں میں جیسے وہ ایک دم بوڑھے ہو گئے تھے۔ چندیا کے بال اُڑ گئے تھے اور جو اِکا دُکا بال چندیا کے کناروں پر تھے وہ بھی سفید براق تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں، رخساروں کی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں، گردن کا گوشت لٹک گیا تھا، پہلے کے فِٹ کپڑے اب ڈھیلے ہو گئے تھے۔

ابا کو کیا ہوتا جا رہا ہے...؟ فرخندہ جب بھی کچھ سوچتی، اُسے بشریٰ یاد آ جاتی اور وہ اپنے دل میں اس کے لیے نفرت اور غصہ محسوس کرتی۔ پانچ سال سے اُس گھر میں کسی نے اُسے یاد نہیں کیا تھا۔ اُس کا نام تک کسی کی زبان پر نہ آیا تھا۔ پھر بھی فرخندہ کو محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی تک اس گھر پر بشریٰ کا تسلط قائم ہے۔ وہ جا کر بھی نہیں گئی۔ اُس کی چیزیں پانچ سال سے ویسی کی ویسی پڑی تھیں، جیسی وہ چھوڑ گئی تھی۔ وہ خود انہیں وہاں سے ہٹا دینے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔ ابا اس کے غم میں بوڑھے ہو گئے تھے اور اماں جب اُس کے جہیز کی چیزیں تیار کرتیں تو اُن کے ہونٹوں سے خاموش آہیں پھسلتی رہتیں۔ یہ سب باتیں فرخندہ کے سینے پر ایک بوجھ بن گئی تھیں۔ وہ اس گھر میں تنہا رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو بشریٰ کے سامنے بے بس و مجبور محسوس کرتی۔ شادی کے اس ہنگامے میں ابھی تک اُس کا کوئی ذکر نہیں آیا تھا۔ پھر ایک دن اماں نے یہ بات چھیڑ ہی دی:

''شادی پر بشریٰ کو نہیں بلاؤ گے؟'' اماں نے چاولوں کی چھان پھٹک کرتے ہوئے بات چھیڑی۔

ابا نے چونک کر اماں کی طرف دیکھا۔ اُن کے چہرے پر ایک لمحہ کے لیے چمک سی آئی۔ لیکن پھر فوراً ہی اُن کا چہرہ بُجھ کر پتھر کی طرح بے جان اور بے حِس ہو گیا۔ وہ فوراً وہاں

سے اُٹھ کر کمرے کے اندر چلے گئے۔

فرخندہ کچن میں کھانا تیار کر رہی تھی۔ کام چھوڑ کر وہ بہانے سے کمرے کے سامنے سے گزری۔ ابا کا سوکھا ڈھانچہ کرسی پر ڈھیر تھا اور وہ سامنے کی دیوار کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ اُن کی انگلیوں میں پھنسا ہوا سگریٹ دھوئیں کے ساتھ سُلگ رہا تھا۔

ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد ابا کے روزمرہ کے معمولات میں بڑی یکسانیت آ گئی تھی۔ صبح سویرے اُٹھنا، بازار سے ضروری اشیاء مثلاً دودھ دہی، سبزی گوشت وغیرہ لانا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر لمبی تان کر سو جانا۔ یا اپنا پُرانا کھڑ کھڑاتا ہوا سائیکل لے کر باہر نکل جانا۔ شام کو کسی دوکان پر جا بیٹھنا اور رات گئے تک بیٹھے گپ شپ میں مشغول رہنا اور رات کا کھانا کھا کر سو رہنا۔

جب سے بشریٰ گئی تھی وہ زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتے جیسے وہ بشریٰ کے خیال سے ڈرتے ہوں۔ اور یہ حقیقت تھی کہ انہوں نے کبھی بشریٰ کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ بشریٰ ان کے دل کے بند کواڑوں کے پاس پانچ سال سے کھڑی سِسک رہی تھی۔

اماں نے ذکر چھیڑا تو اچانک انہیں محسوس ہوا جیسے بند کواڑ خود بخود کُھل گئے ہیں اور بشریٰ بے دھڑک اندر آ گئی ہے۔ اب جب بھی وہ اپنی سوچوں سے چونکتے، انہیں یہ جان کر صدمہ سا ہوتا کہ ان کی سوچ کا مرکز سوائے بشریٰ کے اور کچھ نہ تھا۔ بشریٰ اُن کی سوچوں میں جیسے دھنستی جا رہی تھی... کسی لوہے کے کھمبے یا پتھر کے بُت کی طرح جو ہلائے نہ ہلے، نکالے نہ نکلے۔

یہ انہیں کیا ہوتا جا رہا تھا۔ اُن کا وہ غرور، وہ ٹھسا، وہ اُونچی لمبی ناک کیوں خاک میں ملتی جا رہی تھی۔ لیکن بشریٰ کو ذہن سے اُتار دینا ان کے اختیار میں نہ رہا تھا۔ ان کے دل پر پڑی مضبوط گرہیں خود بخود کھلتی جا رہی تھیں۔

بازار میں یا پارک میں کھیلتے ہوئے ننھے بچوں کو دیکھتے تو انہیں اچانک محسوس ہوتا، جیسے اُن کی دائیں ہاتھ کی کلمے والی اُنگلی کسی نرم نرم اور بھیگی بھیگی مٹھی میں دبی ہے۔ چلتے چلتے وہ بے دھیانی میں رُک جاتے۔ اور جب وہ چونکتے تو کسی پھل والے یا مٹھائی والے کی دکان پر

کھڑے ہوتے۔

''کیا چاہیئے بھائی صاحب؟'' دکاندار کی آواز انہیں چونکا دیتی۔ وہ جھک کر اپنے دائیں بائیں یوں دیکھتے جیسے ان کا کچھ کھو گیا ہو۔ ٹھیک اس وقت کوئی ان کے کان کے پاس تالی بجا کر دُور بھاگ جاتا، چھپ جاتا، کہیں گم ہو جاتا۔

''صاحب کا کچھ کھو گیا ہے۔'' دکاندار کی دوسری تمسخر آمیز آواز انہیں بالکل پریشان کر دیتی۔

''آں...... ہاں...... ہاں..... نہیں نہیں... کچھ نہیں کھویا... کچھ بھی تو نہیں کھویا۔'' وہ تیز قدموں سے چلنے لگتے۔ پارک کے نزدیک پہنچ کر وہ پھر ٹھٹھک جاتے۔ فٹ پاتھ پر اب بھی فوٹو گرافر اپنا اڈا جمائے تھے۔ پس منظر کے لیے کالے نقشین پردے تانے، کرسیاں بچھائے، کیمرے رکھے وہ گاہکوں کے انتظار میں سگریٹ پھونکتے رہتے۔

''یہاں بیٹھ جاؤ بشریٰ!'' کندھوں سے اچکا کر وہ بشریٰ کو کرسی پر بٹھا دیتے۔

''لو بھئی پھر ہو جائے نمبر ون فوٹو۔'' وہ کیمرہ مین سے کہتے۔

''ایسی تصویر اتاروں گا کہ جناب کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔'' کیمرہ مین اپنے پیلے پیلے دانت نکوسے کیمرہ فٹ کرنے لگتا۔

''صاحب تصویر کھنچوایئے گا۔'' وہ چونک پڑتے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ فوٹو گرافر کو کیا جواب دیں۔ پھر وہ احمقانہ انداز میں سر کو جھٹکتے۔

''نہیں بھئی اب کون سی عمر رہ گئی ہے تصویر کھنچوانے کی۔ بس یوں ہی ذرا دیکھنے کو کھڑا ہو گیا تھا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' فوٹو گرافر سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر سگریٹ پینے لگتا اور وہ چھپی چھپی چور نظروں سے ایک ایک چیز کو دیکھتے ہوئے یوں چلتے جیسے پیچھے سے انہیں کوئی دھکیل رہا ہو۔

گھر میں بھی عجب مصیبت ہو گئی تھی۔ بہت سی چیزوں نے ایک دم سامنے آ آ کر انہیں ستانا شروع کر دیا تھا۔ بشریٰ کی اُلٹی پڑی ہوئی تصویر، کتابوں اور رسالوں سے لبالب بھرا ریک... اور بھی بہت سی چیزیں تھیں جنہیں دیکھ کر انہیں بشریٰ یاد آ جاتی۔

بشریٰ کا خیال اُنہیں آ تا رہا اور وہ بشریٰ کے اس اقدام کے اسباب و نتائج پر غور کرتے رہے اور اُس میں اپنے اور بشریٰ کے قصور کا موازنہ کرتے رہے۔ ان کا قصور کیا تھا؟ لیکن اُنکا تو کوئی قصور نہ تھا۔ بشریٰ ہی انہیں غلط سمجھی تھی۔ وہ اس کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ مگر وہ جلد بازتھی اور نفسیات کی چند کتابیں پڑھ کر اپنے آپ کو تجربہ کار اور عقلمند سمجھنے لگی تھی۔

ایک دن دوپہر کو کمرہ بند کر کے انہوں نے مقفل صندوق سے کاغذ کا وہ پرزہ نکالا جو پانچ برس پہلے بشریٰ لکھ کر چھوڑ گئی تھی۔ کسی نام، کسی القاب کے بغیر لکھا تھا۔

''آج جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ میں اس گھر میں کبھی زندگی کی حرارت محسوس نہ کر سکوں گی اور مجھے ہمیشہ بے حس اور موت کے ٹھنڈے سایوں میں جینا ہو گا تو میں نے اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں اپنے باپ کی احسان مند ہوں، جس نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلوائی اور دنیا کے تمام باپوں سے بڑھ کر مجھ سے محبت کی۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ اُن کی یہ شدید محبت آخر میں ایک نفسیاتی اُلجھاؤ اور جذباتی پیچیدگی کا شکار ہو گئی۔ وہ میری زندگی کو اس گھر تک محدود رکھنا چاہتے ہیں جو میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ اس لیے میں جا رہی ہوں۔ اخلاق زیادہ مالدار آدمی نہیں، لیکن وہ میرے روشن مستقبل کا ضامن ضرور بنے گا۔''

بشریٰ

پہلی بار یہ خط پڑھ کر ابا سکتے میں آ گئے تھے۔ انہیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ بشریٰ جو اُن کے جگر کا ٹکڑا تھی، انہی کے جسم کا ایک حصہ تھی، جس کی صورت میں ان کی شبیہہ تھی اور جس کی رگوں میں اُن کا خون، اُنہیں یوں ایک اجنبی انجانے شخص کے لیے چھوڑ کر بھی جا سکتی ہے۔ کاغذ کا وہ پرزہ ہاتھ میں لیے مٹی کی مورت کی طرح وہ گھنٹوں ایک ہی جگہ پر بیٹھے رہے تھے۔ اُس کاغذ کے ٹکڑے نے اُن کے سوچنے، سمجھنے، بولنے اور حرکت کرنے کی تمام قوتوں کو سلب کر لیا تھا اور جب سمجھنے اور محسوس کرنے کی حِسیں واپس آئیں تو انہوں نے پہلی بات یہی

محسوس کی کہ ان کے دل میں بشریٰ کے لیے نفرت اور غصے کے علاوہ کچھ نہیں رہا۔

لیکن اُس دن جب انہوں نے وہ پُرزہ نکال کر پڑھا تو اُنہیں بشریٰ پر نہ کوئی غصہ آیا نہ صدمہ پہنچا۔ انہیں بشریٰ چھوٹی سی ضدّی خودسر اور لاڈلی بچی نظر آئی جس نے محض اپنی ضد اور خودسری میں اتنا بڑا قدم اُٹھا لیا تھا اور اب وہ پچھتا رہی تھی۔ اُن سے ناراض ہو کر اور روٹھ کر کونے میں منہ دبکائے چور نظروں سے اُن کا انتظار کر رہی تھی... کب ابا آئیں اور اُس کو منا لیں۔ اُن کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی... 'پگلی کہیں کی... وہ آج ہی اُسے بلوا لیں گے۔'

مگر جب یہی بات ابا نے اماں سے کہنے کی کوشش کی تو ان کا حلق خشک ہو گیا اور ہونٹ سُوکھ گئے۔ اور انہوں نے اپنی اونچی خاندانی ناک میں ایک جھٹکا سا محسوس کیا۔ بھلا وہ یہ بات اِس طرح کھلم کھلا کس طرح کر سکتے ہیں۔ وہ انتظار میں رہے، شاید اماں پھر یہ ذکر چھیڑیں تو وہ سر ہلا کر اپنی رضا مندی کا اظہار کر دیں۔ لیکن اماں خاموش تھیں۔

قریبی رشتے دار گھر میں جمع ہوتے جا رہے تھے اور فرخندہ خاموشی سے گھر میں چلتے پھرتے یا بند کھڑکی والے کمرے میں چپ بیٹھے، حیرت سے، ابا کی طرف دیکھتی رہتی۔ ابا کی اندر کو دھنسی ہوئی ویران اور خالی آنکھوں میں اچانک کسی کا انتظار آ بسا تھا۔ وہ اُجاڑ کھنڈروں جیسی آنکھیں، گھر کے کونے کونے میں کسی کو تلاش کرتی رہتی تھیں۔ لیکن اماں خاموش تھیں۔ قریبی رشتہ داروں میں سے بھی کسی نے بشریٰ کے متعلق کوئی بات نہیں کی تھی۔ ابا اداس اور منتظر تھے اور فرخندہ حیران تھی۔

شادی میں دو ایک دن ہی رہ گئے تھے کہ ایک دن اماں نے فرخندہ سے کہا:

''اے بٹی یہ اپنے کمرے کو ذرا ٹھیک تو کر لے۔ جو بھی کاٹھ کباڑ اندر ٹھنسا ہے، باہر نکال دے۔ بیٹھنے کو کوئی ستھری جگہ تو ہو۔''

اماں کی بات سُن کر ایک لمحہ کے لیے فرخندہ ٹھٹک گئی۔ اُسے بشریٰ کی چیزوں کو وہاں سے ہٹاتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر شش و پنج میں رہنے کے بعد آخر کار اُس نے کمرہ صاف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سب سے پہلے اُس نے ریک کو صاف کیا۔ فلمی رسالے اور سستے ناول نکال کر اُس نے باہر صحن میں پھینک دیئے اور اُن کی جگہ انگلش اور اردو کے چند معیاری ناول سجائے۔ میز سے بشریٰ کی اُلٹی رکھی ہوئی تصویر ہٹا کر نیا میز پوش بچھایا اور اُس پر

ایک خوبصورت سا چھوٹا ٹیبل لیمپ رکھ دیا۔ مٹیالی چادر والا بستر اور چارپائی بھی وہاں سے ہٹا دی اور کھڑکی کے قریب بڑا پلنگ بچھا کر اُس پر نیا بستر لگایا... نیا تکیہ، نئی کاڑھی ہوئی چادر... دیواروں پر سے بشریٰ کے ہاتھ کے لگائے ہوئے کیلنڈر اور تصویریں اُتار کر نئی تصویریں اور کیلنڈر لگائے۔ صرف ایک تصویر کو ہٹانے کی وہ ہمت نہ کرسکی۔ یہ ایک گول مٹول، سُرخ کپڑوں میں ملبوس بچے کی تصویر تھی۔ موٹے موٹے سیب کی طرح سُرخ سفید رُخسار، نیلے پانیوں جیسی نیلی موٹی اور گہری آنکھیں۔ کیسا خوبصورت بچہ تھا۔ اس تصویر کو دیکھ کر اُسے اچانک بشریٰ کے بچے کا خیال آیا۔ کیا اُس کا بچہ بھی ایسا ہی سرخ سفید اور موٹا ہوگا۔ فرخندہ کا دل اُس اَن دیکھے بچے کی محبت سے بھر گیا۔ تبھی اُسے خیال آیا کہ اُس نے سنا تھا کہ بشریٰ بیمار ہے۔ اُس نے زمین پر بکھری ہوئی بشریٰ کی تصویر کو اُٹھا کر دیکھا۔ بشریٰ مسکرا رہی تھی۔ فرخندہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ اُس نے دوپٹے کے پلو سے تصویر کو صاف کیا اور پھر چپکے سے اُسے اپنے بکس میں چھپا دیا۔

فرخندہ اس نئے کمرے میں کرسیوں کی ترتیب کو ٹھیک کر رہی تھی کہ ابا اچانک اخبار کا پوچھتے ہوئے اندر آ گئے۔ فرخندہ کو یوں لگا جیسے وہ محض بہانے سے اندر آئے ہیں۔ فرخندہ نظریں نیچی کیے کسی مجرم کی طرح کرسیاں اِدھر سے اُدھر کرتی رہی۔ نہ جانے اُسے ابا سے کیوں شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی۔

''اخبار... آج کا اخبار کہاں ہے۔'' اُن کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔ انہوں نے گھومتی سی ایک نظر کمرے پر ڈالی۔ جُھک کر میز پر سے لیمپ کے قریب پڑی ہوئی تصویر اُٹھائی۔

''اوہ!'' تصویر انہوں نے فوراً نیچے رکھ دی... یہ فرخندہ تھی۔

فرخندہ نے دزدیدہ نظروں سے اُن کی طرف دیکھا۔

ابا کی پھیکی، ویران اور بے رونق آنکھوں میں نمی سی تیر رہی تھی۔ انہوں نے باری باری جُھک کر پلنگ اور ریک کو دیکھا۔ بشریٰ کی تمام نشانیوں اور یادوں کو مٹا دیا گیا تھا۔ اب وہاں کوئی چیز ایسی نہیں تھی جسے دیکھ کر بشریٰ بے اختیار یاد آ جائے۔

''اخبار نہیں ہے یہاں؟'' انہوں نے جیسے وہاں بے مطلب کھڑے رہنے کا عذر پیش کیا۔ پھر باہر جانے کو مڑتے ہوئے اچانک اُن کی نظر بند کھڑکی پر پڑی۔ ایک لمحے کے لیے

وہ ٹھٹھک گئے۔ اُنہیں وہ وقت یاد آیا جب اُس کھلی کھڑکی کے پاس بشریٰ بڑے ٹھسے سے بیٹھی اُلم غلّم رسالے پڑھا کرتی تھی اور وہ دُور صحن میں سر کے نیچے بازو رکھ کر لیٹے، اُس کی ان خود سریوں پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھایا کرتے تھے۔ بشریٰ انہیں اس کھڑکی کے بہت نزدیک، بہت قریب محسوس ہوئی۔ انہوں نے مُڑ کر فرخندہ کی طرف دیکھا، پھر ان کے تھرتھراتے ہونٹوں کو جنبش ہوئی:

''اماں سے چابی لے کر یہ کھڑکی کھول دو۔''

گھر کا مالک

اُس کی عمر اس وقت ستر برس کے لگ بھگ تھی۔ اُس کے اعضاء مضمحل ہو چکے تھے اور خون میں سہارا دینے والی گرمی خنکی میں بدل چکی تھی۔ وہ اس وقت عمر کے اُس حصے میں تھا جہاں سے پچھلی ساری زندگی ایک وحشت ناک غلطی کی طرح نظر آنے لگتی ہے اور گزرے ہوئے وقت کا پچھتاوا سینے میں زخم بن جاتا ہے.... اور ..... سوں..... ہوں........ ایک لمبی سانس سے موت کی خوشبو کو اپنے آس پاس سُونگھا جا سکتا ہے۔

اپنے کمرے کی کالی تنہائیوں میں اُس نے کئی بار موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اُس کا گلا گھٹ گیا تھا اور کنپٹیوں پر پسینے کی دھاریں بہہ نکلی تھیں۔ پھر جب وہ اُٹھا تھا تو اُس نے سینے میں اپنوں کے ساتھ ساتھ کبھی نہ دیکھے اور ملے لوگوں کی محبت کو موجیں مارتے محسوس کیا تھا اور انسانوں سے چمٹ جانے کی بھوکی خواہش کو پایا تھا۔

وہ کھونٹی سے اپنا سوٹ اُتارتا جو بدرنگ اور ڈھیلا ہو چکا تھا۔ پھر اُسے بڑی احتیاط سے پہن لیتا۔ چھیچھڑا سی ٹائی گلے میں باندھتا جو سوکھی اور پتلی گردن میں بدزیب دکھائی دیتی تھی۔ پھر وہ سر پر ٹوپی اوڑھتا، بوٹوں پر سوکھا برش مارتا اور گھر سے باہر نکل جاتا۔ باہر کی کُھلی اور روشن فضا میں وہ لمبے لمبے سانس لیتا اور زندگی اور موت کی خوشبوئیں آپس میں ایک ہو جاتیں۔ وہ نپے تُلے قدموں سے گلی عبور کرتا اور اُسے محسوس ہوتا جیسے وہ انہیں آخری بار دیکھ رہا ہے۔ اُس کے دونوں جانب کھڑے مکان اُسے اجنبی اور نئے لگتے۔ پھر وہ سڑک پر آتا اور اُسے اپنی بیٹی کا خیال آ جاتا۔ وہ بس میں سوار ہو جاتا اور ہجوم کی خوشبو کو سونگھتا اور محسوس کرتا جیسے وہ چپکے چپکے ان کی زندگیوں سے کچھ چرا رہا ہو۔ بس رُک جاتی تو وہ اُتر پڑتا اور بڑے

بھرے بھرے دل کے ساتھ وہ بیٹی کے گھر کا زینہ چڑھنے لگتا جو بڑا طویل تھا اور لگتا تھا جیسے کبھی ختم نہ ہوگا۔ کبھی تو وہ آدھے زینے سے بیٹی کے حیران چہرے کا خیال کر کے واپس لوٹ جاتا۔ مگر اکثر وہ اوپر جا پہنچتا اور توقع کرتا جیسے بیٹی ابھی ''ابا جی'' کہہ کر اُس سے چمٹ جائے گی اور پُھسک پُھسک کر رونے لگے گی کہ وہ تھا۔ مگر اُس کی بیٹی اُسے دیکھ کر صرف حیران ہوتی اور یہ حیرانی اُس کے لیے ہرگز نئی نہ ہوتی تھی۔

''ابا جی خیر تو ہے؟''......اور وہ کھنکار کر اپنی رندھی ہوئی بلغمی آواز کو صاف کرتا۔

''ہاں بیٹی سوچا ذرا بچوں کو دیکھ آؤں۔''......... وہ آنکھیں چرا کر کہتا اور جب ننھا اُسے دیکھ کر خوشی سے تالی بجاتا اور دونوں ہاتھ پھیلائے اُس کے پاس آنے کو لپکتا تو وہ اپنے سینے کے بوجھ کو بھول جاتا۔ وہ اُسے گود میں لے کر اپنے ساتھ چمٹا لیتا اور اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ ننھے کے چھوٹے سے نرم اور گرم محبت بھرے وجود کی پناہ میں محفوظ ہو گیا ہے... بالکل محفوظ اور اب اُسے کوئی خدشہ نہیں رہا۔ مگر جب وہ اُسے الگ کر دیتا تو اُسے اپنے وجود کے خالی پن کا شدید احساس ہوتا۔ اور جب وہ بھاری دل کے ساتھ زینہ اترتا تو اس کے جسم کا بوجھ اُس کے کندھوں پر ہوتا۔

کبھی کبھی وہ اپنے بیٹے کے دفتر بھی پہنچ جاتا۔ وہ اُسے اپنی میز کے پیچھے سے دیکھ لیتا اور جھٹ پٹ باہر آ جاتا۔

''کیا بات ہے ابا جی؟''.....وہ تشویش سے پوچھتا۔.. مگر وہ تو اُس کے سامنے موجود تھا پھر پریشانی کی کیا بات تھی۔ وہ سیدھا اُس کے چہرے کی طرف کبھی نہ دیکھتا اور دائیں بائیں دیکھتے ہوئے خفیف سا مسکراتا۔

''کچھ نہیں بیٹا... اِدھر آیا تھا، سوچا تمہیں دیکھتا جاؤں۔''

''میں ٹھیک ہوں اور بہت مصروف ہوں۔ آپ گھر چلے جائیں۔ یہیں اس بس سٹاپ سے چڑھ جائیں۔'' لڑکے کی آواز میں اب اُکتاہٹ ہوتی۔ وہ آگے آگے چلتے ہوئے منہ سے کچھ نہ بولتا اور صرف سر کو ہلاتا..... اور سوچتا...... جب وہ چھوٹا سا تھا تو اُسے اپنے ساتھ گُھمانے اور اُس کی اَن کہی خواہشوں کو بھی پورا کر دینے میں وہ کتنا مستعد ہوتا تھا۔ وہ اُسے کچھ دے کر کتنا خوش ہوتا تھا۔ وہ جب باتیں کرنا نہیں جانتا تھا وہ تب بھی اُس کی باتوں کو سمجھ

لیتا تھا۔ وہ اس سے کس قدر محبت کرتا تھا۔ مگر اس کے برعکس اُس کا بیٹا کتنا روکھا، بے مروت اور لاپرواہ تھا۔ وہ سر جھکائے راستہ طے کرنے لگتا۔ رات کو اُس کا بیٹا تنبیہ کے طور پر کہتا۔

''ابا جی یوں دفتر نہ آیا کریں اور اس سوٹ کی جان بخشی کر دیں۔ اب یہ وضع قطع اچھی نہیں لگتی...... میں آپ کو دوسرے کپڑے لا دوں گا..... اور اگر پھر کبھی یہ سوٹ نظر آیا تو سچ مچ آگ لگا دوں گا۔ اور ہاں کل باجی آئی تھی اور کہہ رہی تھی آپ وہاں بھی روزانہ پہنچ جاتے ہیں۔ اور آپ کو دیکھ کر اُس کا دل دھک سے رہ جاتا ہے کہ کہیں کوئی بُری خبر نہ ہو۔ آخر بات کیا ہے؟''

وہ بڑی خاموشی سے اُتارے ہوئے کوٹ پر برش پھیر پھیر کر اس کی گرد چھڑاتا رہتا۔

''سنتے ہیں ابا جی۔''....... بیٹا تکرار کرتا۔

''سُن لیا بابا جاؤ''........وہ گول مول لہجے میں جواب دیتا۔

اور جب وہ باہر چلا جاتا تو اُسے اپنے بہت قریب سے اور کبھی خود اپنے اندر سے تنہائی کے کھولتے سمندر کی سنسناہٹ سنائی دینے لگتی۔۔۔۔ اور اُس کی کنپٹیوں پر پسینہ بہنے لگتا اور اُس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل جاتیں...... اور اُس کے چاروں طرف کالے کالے دَھبے اُبھر آتے۔

وہ سب اکٹھے ہو کر کیا کرتے رہتے تھے۔ باتوں کی کیسی کھچڑی سی پکتی رہتی تھی۔ اُس کے پلے کچھ نہ پڑتا اور کوئی اُسے بتانے یا سنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا۔ شاید اس کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ مگر کچھ جاننے کی پاگل خواہش اُسے بے چین رکھتی۔ وہ ذرا ذرا سی آہٹ پر اُٹھ کر دروازے میں جا کھڑا ہوتا اور خالی آنگن کو دیکھتا رہتا...... جب گھر میں کوئی کھڑ بھڑ ہوتی، برتنوں اور چمچوں کے بجنے اور چھنکنے کی آوازیں معمول سے زیادہ ہوتیں اور جب اونچی آواز کے بجائے سرگوشیاں کی جاتیں تو وہ بے کلی میں کمرے سے آنگن تک تانتا سا باندھ دیتا۔

''ضرور کوئی مہمان آیا ہے۔ لیکن یہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کیوں آیا ہے؟'' کتنے سارے سوال اُس کی زبان پر بچھو کا ڈنک بنے رہتے اور وہ مضطرب ہو جاتا۔ اب ان سب سوالوں کا انہیں ایک جواب دیا جاتا۔

''ابا جی آپ کے جاننے والے نہیں ہیں۔''

اور وہ انہی لوگوں کے لیے تو تڑپتا تھا... اجنبی اور انجان لوگ جن سے وہ کبھی نہیں ملا تھا لیکن جن کی محبت اُس کے دل میں بھری ہوئی تھی۔

''یہ ابا جی کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟'' ایک دن ایک بیٹے نے شکایتاً کہا۔

''کل میں اپنے دوست کے ساتھ بیٹھا تھا کہ انہوں نے دروازے کے سوراخ پر اپنی آنکھ ٹکا دی۔ دوست بے تکلف تھا۔ اُس نے بھی دیکھ لیا، ہنس کر کہنے لگا:

''غالباً تمہارے ابا جی جھری میں سے دیکھ رہے ہیں۔'' اور میں پانی پانی ہو گیا۔ آخر ابا کو کوئی سمجھاتا کیوں نہیں۔ سودائیوں والی حرکتیں کرنے لگے ہیں۔''

اور یہ ساری بات اُس نے دروازے کی اوٹ سے سنی تھی۔۔۔۔۔

کبھی بند دروازوں کے پیچھے سے ہنسنے بولنے کی ملی جلی آوازیں سنائی دیتیں تو انسانوں کی پیاس اُس کے اندر بھڑک اُٹھتی اور وہ چوری چوری، دبے دبے کبھی بند دروازے کو تھوڑا سا کھول دیتا، بس اتنا کہ اس کی دونوں آنکھیں اندر کا حال اُسے بتا سکیں۔ مگر اُس کی عینک بجلی کی روشنی میں چمک اُٹھتی اور کوئی ڈانٹ کر پوچھ بیٹھتا:

''کیا بات ہے ابا جی''۔۔۔۔۔ اور وہ بوکھلا کر اندر آ جاتا۔

''میں نے کہا وہ کہاں ہے بھئی۔۔۔ وہ۔۔۔۔'' وہ کچھ ڈھونڈنے کے انداز میں چاروں اَور دیکھتا۔

''کیا وہ۔۔۔؟''۔۔۔۔۔۔ نہایت تلخی سے پوچھا جاتا۔

''ارے بھئی وہ۔۔۔ وہ''۔۔۔۔ وہ ٹامک ٹوئیاں مارتا باہر نکل جاتا اور وہ نہایت خاموشی اور بیزاری سے اُس کے چلے جانے کا انتظار کرتے۔۔۔ اور جب وہ نکل جاتا تو وہ سکون کا سانس لیتے اور ایک دوسرے کے چہروں کو پڑھتے۔

''یہ ابا جی کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟''...... وہ چند لمحے بڑی پُراسرار خاموشی میں رہتے جیسے سوگ منا رہے ہوں..... پھر وہ سب کچھ بھول جاتے۔ مگر وہ اپنے خالی وجود کے بوجھ کو کس طرح بھول سکتا تھا۔ مگر اس میں بھی کوئی فائدہ نہ تھا۔ سناٹے اُس کے ساتھ تھے، سناٹے اُس کے ہمراہ قدم ملا کر چلتے تھے۔ وہ ہنگاموں میں پہنچ کر بھی سناٹے کی گونج کو سُن لیتا تھا... یہ

سناٹا اس کے اندر تھا اور باہر بھی.......

''ابا جی کو اب یہ نوعمروں والی چھچھوری حرکتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ انہیں بزرگوں کی طرح خاموش اور دنیاداری سے پاک زندگی بسر کرنی چاہئیے۔'' وہ بیٹھے اکثر مشورے دیا کرتے۔

اور وہ خاموش کمرے میں ٹانگ پر ٹانگ دھرے لیٹا کسی کتاب کے مطالعے میں غرق ہو جاتا......

رات کو جانے کہاں سے موٹی موٹی بلیاں آ جاتیں اور دیوار پر بیٹھ کر رونے لگتیں۔ یہ آواز اُس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ فوراً ڈنڈا ہاتھ میں لیے چھت پر پہنچ جاتا۔ پھر اُس کے اور بلیوں کے درمیان دوڑ کا مقابلہ ہونے لگتا۔ کبھی کوئی پراسرار بلی اوپر کی منزل سے نچلی منزل پر سیدھی دھپ سے کُود جاتی جیسے کسی نے اوپر سے ٹھنسا ہوا تھیلا نیچے پھینک دیا ہو۔ وہ ڈنڈا لیے نیچے کو بھاگتا۔

''مردار مر چکی ہوگی۔'' اُسے یقین ہوتا۔

مگر اسی وقت بلی نیچے سے اوپر کی طرف بھاگتی اور کھال سکیڑے لمبی لمبی نہایت پھرتی سے اُس کے پہلو میں سے نکل جاتی...... اور وہ نیچے اُس کا مردہ ڈھونڈتا رہ جاتا...... ''عجیب بلی تھی کہ اپنا آپ اُٹھا کر لے گئی۔''

اور وہ حیرت زدہ سا پلنگ پر بیٹھ جاتا اور اُسے اپنا بوجھ اپنے کندھوں پر محسوس ہوتا۔

کتابیں پڑھنے سے اُسے رغبت نہ تھی۔ مگر اب وہ اکثر مذہبی کتابوں میں اچاٹ دل سے پناہ ڈھونڈ لیتا۔

صبح کو وہ ہمیشہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا۔ جلدی سے جوتے پہنتا اور کواڑ بجاتا اندر پہنچ جاتا۔

''لاؤ بھئی لاؤ برتن... کچھ لانے والا ہے۔''

''سب کچھ منگوا لیا گیا ہے۔''

''اچھا بھئی'' .... وہ گھٹے گھٹے دل کے ساتھ لوٹ پڑتا.....

بارش ہوتی تو وہ کسی دن مٹی سے بھرا تسلا کندھے پر رکھے بمشکل تمام اوپر جا پہنچتا۔ کوئی دیکھ لیتا تو پکار اُٹھتا:

''ابا جی کیا کر رہے ہیں؟''

''ارر...... بیٹا میں نے کہا مٹی ڈال دوں ورنہ چھت ٹپکنے لگے گی''......

وہ ہنسنے لگتے........ ''واہ! ابا جی دیکھتے نہیں سب چھتیں پکی کروا دی گئی ہیں۔''

''اچھا...... اوہ......'' وہ نیچے اُتر آتا... شکستہ اور محجوب سا...

کسی وقت وہی اس گھر کے سیاہ و سپید کا مالک تھا اور اسی کے اشارے پر سب کچھ ہوتا تھا۔ مگر کسی فطری مگر غیر محسوس عمل نے اُسے گھر کے اس کونے میں کسی بیکار شے کی طرح ڈال دیا تھا اور وہ حیران تھا کہ اب اُس کے بغیر گھر کیسے چل رہا تھا۔ اُن میں اس جیسی عقل اور تجربہ کہاں تھا...... یقیناً سب کچھ بگاڑ رہے ہوں گے۔

وہ چپکے چپکے گھر میں گھوم پھر کر ٹوٹی ہوئی بیکار چیزیں اُٹھا اُٹھا کر اپنے کمرے میں جمع کرتا رہتا۔ کبھی کوئی چیز مرمت طلب ہوتی تو اُس کی مرمت بھی کر دیتا اور پھر چپکے سے وہیں رکھ آتا...... اور پھر دروازے کی اوٹ سے وہ واویلا سنتا جو وہ چیز کے ستیاناس اور غارت ہو جانے پر مچاتے تھے۔ کتنے بیوقوف اور ناشکرے تھے وہ...... وہ اُن پر افسوس کرتا........

رات کو وہ دیر تک جاگتا رہتا...... اور جب وقت بے وقت دروازے کی زنجیر ہلتی تو وہ لپک کر دروازہ کھول دیتا......

''میں جاگ رہا تھا'' ...... وہ محض اپنے احساسِ اہمیت کی تسکین کی خاطر کہتا۔ مگر آنے والے کو اُس کی تکلیف کا احساس ہو جاتا۔ آخر ایک دن دیر سے آنے والوں کے لیے باہر سے تالا ڈال دیا گیا جس کی چابیاں اُن کے پاس تھیں۔ وہ ابا جی کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ مگر اس تکلیف میں کتنی راحت تھی اور ان کی اس حرکت سے اس کے اندر کا خالی پن، کس قدر بڑھ گیا تھا... یہ وہ کبھی نہ جان سکتے تھے یا ممکن ہے وہ بھی ستر برس کی عمر کو پہنچ کر اس کنوئیں کا پیندا دیکھ لیتے... مگر وہ بدستور جاگتا رہتا تھا اور جب قفل کھلنے کا کھٹکا ہوتا تو وہ فوراً بلغمی آواز میں پوچھنے لگتا۔

''کون ہے؟...... کون ہے بھئی؟...... بولتے کیوں نہیں؟...... اچھا تم ہو...... میں جاگ رہا تھا'' ...... وہ اپنی ضرورت جتاتا مگر آنے والا پریشان ہو جاتا۔

''ابا جی آپ اطمینان سے سو رہا کیجیے۔''

"کیوں بھلا، ذرا سا جاگنے میں مجھے کون سے گڈے لادنے پڑتے ہیں۔" وہ بڑی صلح جُوئی سے کہتا۔

پھر ایک دن اُس نے سنا گھر میں پانی کا نیا پائپ لگایا جا رہا ہے۔ اُس زمانے میں پمپ کی اہمیت گھٹ گئی تھی اور ان کے غسل خانے میں ابھی تک پمپ ہی کام دے رہا تھا۔ اب نیا نل لگوا لیا جانا ضروری ہو گیا تھا۔

ایک دن سب اکٹھے ہوئے اور باہم صلاح مشورے کرنے لگے۔ مناسب جگہ تجویز کی گئی اور پھر ایک فیتے سے جگہ کی پیمائش بھی کر لی گئی تا کہ پائپ فوراً ہی خریدا جا سکے۔

اُس سے کسی نے ذکر نہیں کیا تھا کیونکہ ایک عرصے سے وہ اس کی نفی کر چکے تھے اور اب کسی معاملے میں اُسے مشورے کے قابل نہ سمجھا جاتا تھا۔ خود اس کی طرف سے بھی کسی دخل اندازی کا وہم تک نہ تھا۔ وہ پچھلے کئی برس سے بالکل خاموش اور الگ تھلگ زندگی بسر کر رہا تھا۔

مگر جب اُس نے یہ سب کچھ سُنا تو اُس کے دل میں ایک کھٹک سی پیدا ہو گئی۔ پمپ کی موجودگی میں دوسرے نل کی کیا ضرورت تھی اور اگر تھی تو پھر اب پمپ کا کیا بنے گا......وہ بے چین اور مضطرب سا ہو گیا اور جوتے کھڑ کھڑاتا ہوا اُن کے درمیان جا پہنچا.....

"پمپ کا کیا بنے گا؟"......اُس نے ایسی سنجیدگی سے کہا کہ سب کو ہنسی آ گئی۔ اب تک پمپ کا ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ دراصل اُسے اہمیت کے قابل سمجھا ہی نہ گیا تھا۔

"اُس کا بھی کچھ نہ کچھ بن جائے گا ابا جی"......اُس کے بیٹے نے بڑے تمسخر سے کہا۔

"مگر"..........

"مگر ابا جی آپ کو ان بکھیڑوں سے کیا۔ آپ اپنے کمرے میں آرام کیجیے۔"

وہ خاموشی سے پلٹ آیا مگر وہ کھٹک اُس کے دل میں زخم پیدا کرتی رہی۔ اور وہ ایک اَن جانے دکھ اور خوف میں گھلنے لگا۔ یہ پمپ اُس کے ہاتھوں لگا تھا اور اتنا ہی پرانا تھا جتنا کہ یہ گھر اور اُسے اکھیڑ دینا گویا خود اُس کی اور اِس گھر کی بنیادوں کو اکھیڑ دینا تھا۔

مگر وہ بے بس تھا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے

کندھے کا بوجھ جلد ہی دوسرے کندھوں پر پڑنے والا ہے۔ اُس کی پریشانی بڑھتی گئی۔

پھر ایک دن مستری آیا اور کام شروع کر دیا گیا۔ اور یہ دیکھ کر اُسے خوشی ہوئی کہ پمپ کو اکھیڑے بغیر نیا پائپ لگایا جا رہا تھا۔ اُس کی بے اطمینانی جاتی رہی اور وہ باہر مستری کے پاس بیٹھا حقہ پیتے ہوئے نئی پرانی باتیں کرتا رہا۔

تیسرے دن کام مکمل ہو گیا...... نل لگ گیا اور جب پیتل کی چمکتی دمکتی ٹونٹی سے صاف شفاف پانی شراٹے بھرتا نکلا تو بچوں کی طرح وہ اس میں ہاتھ بھگو کر اور منہ پر چھینٹے مار کر بہت خوش ہوا...... وہ اس لیے بھی زیادہ خوش تھا کہ پمپ اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔

مگر اگلے دن اُس کا سارا اطمینان جھاگ کی طرح بہہ گیا۔

پمپ کو اکھیڑ دیا گیا تھا۔ وہ سناٹے میں آ گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ کارروائی دیکھتا رہا۔ مگر جب مستری پمپ کو اُٹھانے کے لیے آگے بڑھا تو وہ تڑپ کر باہر نکل آیا۔

''یہ تم نہیں لے جا سکتے''......... اُس نے طیش میں مستری کے دو تین تھڈے رسید کر دیے۔

''ابا جی کیا کرتے ہیں آپ؟''..... اُس کے بیٹے نے اُس کے غصے کی شدت کو محسوس کر کے حیرت سے کہا۔

''بھاگ جاؤ یہاں سے''...... اُس نے غصے سے ہانپتے ہوئے مستری سے کہا۔

''مگر سودا تو ہو چکا ہے ابا جی''........ لڑکا لپک کر قریب آ گیا۔ وہ اُسے کندھوں سے پکڑ کر پرے ہٹا دینا چاہتا تھا........ مگر اُس نے ایک جھٹکے سے خود کو چھڑا لیا۔

''یہ سودا صرف گھر کا مالک کر سکتا ہے۔ اور وہ یہ سودا نہیں کرے گا۔ تم اسے اکھیڑ سکتے ہو۔ مگر بیچ نہیں سکتے...... ہرگز نہیں۔''

اُس نے بیٹے کی آنکھوں میں اپنی غصے سے دہکتی آنکھیں ڈال دیں۔ یہ آنکھیں اُس کا ماضی تھیں۔

مگر جب وہ پمپ کے اجزاء کو اپنے کمرے میں لے جا رہا تھا تو وہی آنکھیں بھیگ کر اُس کا حال بن چکی تھیں۔

ہدف

چھ ماہ کی تنخواہ دے کر اُسے اس کی طویل نوکری سے جب فارغ کیا گیا تو اندازاً اُس کی عمر ساٹھ سال سمجھ لی گئی، کیونکہ اس کی صحیح عمر کا اندراج کہیں نہیں تھا۔ جب وہ چھ ماہ کی تنخواہ مٹھی میں دبائے صاحب کے کمرے سے نکلا تو کسی نے بھی اُس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار نہیں کیا جیسے سب اس کے غلیظ وجود سے جان چھڑانا چاہتے ہوں۔

کمرے سے نکلتے ہی اُس کی پہلی نظر کوریڈور میں رکھی لوہے کی کرسی پر گئی... یہی برسوں سے اُس کی سنگی ساتھی رہی تھی۔ پھر وہ سیڑھیاں اُترنے لگا۔ آج اُس کی بغل میں لوہے کی موٹھ والا بڑا جھاڑو نہیں تھا جو عموماً بغل میں دبائے وہ دفتر میں چلتا پھرتا دکھائی دیتا تھا۔ وہ اس دفتر کا سب سے پرانا ملازم تھا اور دفتر کے تمام ادنیٰ اور حقیر کام اُس کے سپرد تھے۔ اس حساب سے وہ اس دفتر کا سب سے غیر اہم اور حقیر آدمی تھا۔ صاحب لوگ اُسے sweeper کہہ کر بلاتے اور باقی لوگ اوئے ابے سے کام چلا لیتے۔ وہ بھی اس روّیے کا خود کو حقدار سمجھ کر ہر حقارت بھری آواز پر ذرا سہولت اور آرام سے ہنکارا بھرتا جس پر آواز دینے والا خاصا تلملا جاتا۔

صبح سویرے وہ دفتر کا ایک ایک کمرہ کھول کر جھاڑ پونچھ کرتا۔ صفائی کرنے میں وہ عموماً چھوٹی موٹی چیزیں اُٹھا لیتا، مثلاً پنسلیں، چھوٹا موٹا سکہ، کاغذ، پرانا بے رنگ رومال یا کوئی گرا پڑا نوٹ۔

دفتر کے بڑے زینے کے نیچے تھوڑی سی جگہ تھی جو آگے سے کھلی مگر پیچھے سے قبر کی طرح تنگ تھی۔ اسی جگہ پر وہ اپنی چیزیں اکٹھی کرتا رہتا اور فارغ وقت میں وہاں بیٹھ کر انہیں

الٹتا پلٹتا۔ بعض اوقات وہ پنسل سے کاغذ پر لکیریں سی کھینچنے کی کوشش کرتا مگر سالہا سال سے جھاڑو کا موٹا دستہ ایک ہی انداز میں پکڑنے سے اُس کی انگلیاں ایک ہی زاویے میں مڑنے اور کھلنے کی عادی ہوگئی تھیں۔ مٹھی کو اپنی مرضی سے بند کر کے پتلی پنسل کو پکڑنا اب اُس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ پھر بھی وہ پنسل پکڑنے کی کوشش ضرور کرتا۔

دفتر میں جب پنسلیں، پین زیادہ ہی غائب ہونے لگتے تو ایک غدر سا مچ جاتا۔ اس کی طلبی ہوتی۔ اتنی چھوٹی سی بات پر اُسے کچھ اس طرح کھینچا رگیدا جاتا کہ اس کے اندر کا انسان کچھ اور چھوٹا پڑ جاتا۔ وہ سب کچھ سن کر اپنی چھوٹی چھوٹی مندی آنکھیں زمین سے ذرا سی اوپر اٹھا کر ہاتھ مروڑنے لگتا۔ اس کی یہ حرکت بھی انہیں گستاخانہ لگتی۔ آخر زمین سے اُٹھتے اُٹھتے اُس کی نگاہیں خلا میں کیوں جم جاتی تھیں؟ ضرور کوئی وجہ ہوگی۔ آخر وہ کیا سوچتا تھا؟ دماغ جھنجھلانے لگتے۔ مگر جب کبھی وہ پوری نظر اُٹھا کر دیکھتا تو یہ بھی اُس کی گستاخی شمار ہوتی:

''ابے نیچے کر اپنی منحوس نظریں۔'' اُسے کچھ اور ذلیل کیا جاتا۔ وہ تھا ہی کچھ ایسا کہ اُسے دھتکارا جاتا۔

صفائی کے علاوہ بند گٹر بھی وہی کھولتا۔ گٹر کے اندر گھس کر گارا نکالتا، پیکوں سے بھرے اگالدان صاف کرتا، بالٹیاں بھر بھر کر کولروں میں پانی ڈالتا، چھٹی کے دن پائپ لگا کر وہ سارا دفتر دھو ڈالتا۔

دفتر میں جب چوہوں کی بھرمار ہو جاتی تو چوہوں سے بھی وہی نبٹتا۔

کڑکی میں روٹی یا پنیر کا ٹکڑا پھنسا کر وہ بڑی ہوشیاری سے چوہے پکڑتا۔ یہ بڑے بڑے موٹے بھد بھداتے چوہے اُس کی کڑکی میں آن پھنستے۔ وہ ان پھنسے ہوئے چوہوں کی زرد زرد آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا تو وہ ایک بالکل دوسرا آدمی ہوتا...ایک بھرپور اور پراعتماد آدمی۔ وہ بڑے دبدبے سے انہیں بُرا بھلا کہتا اور وہ سارے بُرے بُرے غلاظت میں لتھڑے الفاظ جو وہ سنتا تھا، ان کے لمبوترے کانوں میں انڈیل دیتا اور دبی ہنسی ہنستا اور ایسے لہجے میں دھیرے دھیرے بولتا کہ کوئی دوسرا سن کر بھی سمجھ نہیں سکتا تھا۔

''بدمعاشو...... اُچکّو...... میسنو۔'' وہ ہولے ہولے لفظ دبا دبا کر انہیں کہتا اور کافی مسرور ہوتا۔ اُس کے بس میں نہیں تھا ورنہ وہ ایک آدھ تھپڑ بھی انہیں رسید کر دیتا۔ البتہ اس

کے پاس ایک پتلی نوکدار سلاخ تھی۔ کبھی ترنگ میں ہوتا تو سلاخ کی نوک انہیں چبھوتا۔ چوہے چیں چیں کر کے تڑپتے اور وہ ایک ظالمانہ مسکراہٹ سے انہیں دیکھتا۔ پھر وہ ان زخمی چوہوں کو کہیں رفع دفع کر آتا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ان اَدھ موئے چوہوں کو کہیں قریب ہی پھینک دیتا تھا کیونکہ جلد ہی سارے دفتر میں مردہ چوہوں کی بدبو پھیل جاتی اور لوگ ناک پر رومال رکھے ''اوئے ہوئے'' کرتے پھرتے اور جگہ جگہ تھوکتے۔ اُس کی ضرورت پھر محسوس ہوتی اور اسے چوہے ڈھونڈنے پر لگا دیا جاتا۔ وہ بڑی خوشی اور اہتمام سے مردہ چوہے تلاش کرتا اور انہیں دموں سے پکڑ پکڑ کر اکٹھے کرتا۔

دفتر کا کوئی آدمی اُسے منہ لگانا پسند نہیں کرتا تھا۔ فارغ وقت میں وہ کوریڈور میں پڑی کرسی پر بیٹھا اونگھتا رہتا۔ وہ ایسے غیر محسوس طریقے سے سکڑ سمٹ کر بیٹھتا کہ پاس سے گزرنے والے اُسے دیوار کا حصہ ہی سمجھ بیٹھتے۔

سال میں ایک آدھ بار جب کسی المناک حادثے کی خبر اخبار میں چھپتی تو کارپوریشن کے اس آفس کے بھی کان کھڑے ہوتے اور دفتر والے 'کتا مار' مہم کا آغاز کر دیتے۔ اُسے فوراً طلب کیا جاتا، کیونکہ اس مہم کا بھی اُسے ماہر سمجھا جاتا تھا۔ وہ اس مہم میں بڑھ چڑھ کر جوش و خروش سے حصہ لیتا۔ اس وقت وہ پھر ایک پُر اعتماد آدمی ہوتا۔ وہ آگے بڑھ بڑھ کر قیمتی مشورے دیتا۔ ایسے وقت اُس کی بات کو غور سے سن لیا جاتا کیونکہ اس کام میں اُس کو خصوصی مہارت حاصل تھی اور اس کام کو عین اس کی حیثیت کے مطابق سمجھا جاتا تھا۔

اگرچہ اس کا منہ پوپلا تھا اور بیشتر دانت گر چکے تھے مگر وہ بڑی خوشی سے اس مہم میں حصہ لیتا اور بڑی ہوشیاری اور مہارت کا مظاہرہ کرتا۔

چوہوں کی طرح وہ کتوں کو بھی غلیظ غلیظ گالیاں دیتا۔ اُن کی دمیں مروڑتا۔ اُن کے منہ پر تھوکتا۔ انہیں رسے کے ساتھ پیٹتا پھر خوب ہنستا اور ان کے ساتھ بلی چوہے کا سا کھیل کھیلتا۔ پورے تن من دھن کے ساتھ وہ کسی بھوکے درندے کی طرح ان پر جھپٹ پڑتا۔

اس مہم میں اُس کی سرگرمی کو دیکھ کر دفتر والے حیران رہ جاتے... کیا یہ وہی ست الوجود میسنا تھا؟ وہ خود بھی اپنے اوپر حیران ہوتا۔ یہ کون سا غصیلا جن اُس کے اندر سے برآمد ہوتا تھا؟ اس میں حیرت ناک تبدیلی آ جاتی۔ وہ بالکل کوئی اور بن جاتا۔

کیسے کیسے جغادری قسم کے کتوں کا اُس نے مقابلہ کیا تھا اور انہیں پچھاڑا تھا۔ یوں جناتی قسم کی طاقت سے انہیں لوٹ پوٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ جوش میں اکثر اُس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتی۔ وہ سانپ کی طرح پھنکارتا۔ اس وقت بظاہر برہم نظر آنے کے، اندر سے وہ ایک خوش اور مطمئن آدمی ہوتا۔ مہم کے بعد بھی اس پر ایک خمار سا چھایا رہتا۔ کئی دنوں بعد تک اپنے 'کچھ' ہونے کا احساس اس کی ہر حرکت سے جھلکتا۔ وہ ہر کسی کو داد طلب نظروں سے دیکھتا لیکن جلد ہی اُسے رگڑ رگید کر اس کی پرانی اوقات پر لے آیا جاتا۔

اُس نے برسوں سے اس دفتر میں ایک بے اوقات آدمی کی طرح کام کیا تھا اور جب اُسے نکالا گیا تو اسی بے قدری کے ساتھ۔

کسی نے اُس کے ساتھ افسوس یا ہمدردی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اُس نے اپنی اس حق تلفی پر کوئی آواز نہیں نکالی۔ چپ چاپ لوہے کی ریڑھی پر لوہے کے دستے والا بھاری جھاڑو رکھ کر وہ دفتر سے باہر نکل آیا۔ اُس کی جگہ پر فوراً ہی ایک سفارشی کو رکھ لیا گیا جس کی نوکری بھی پکی کر دی گئی اور جس کے نام کا اندراج بھی رجسٹر میں کر دیا گیا۔

دفتر سے نکالے جانے کے بعد اب اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔

زندگی کا بیشتر حصہ اُس نے گندگی اور غلاظت میں لتھڑے وجود کے ساتھ گزارا تھا۔ اب کوئی صاف ستھرا کام کرنے کا کوئی تصور اُس کے پاس نہیں تھا۔ البتہ پیٹ کی پکار تھی جس کے لیے اُسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ چھ ماہ کی تنخواہ کب تک چل سکتی تھی۔ بہت جزرسی کے باوجود وہ کم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ بہت بدحال اور پریشان تھا۔

کچی آبادی کے اس کچے کوٹھے سے اس کا تعلق ہمیشہ نہ ہونے کے برابر رہا تھا، جب اُس کی بیوی زندہ تھی تب بھی اور اب جب کہ وہ مر چکی تھی۔ وہ ہمیشہ گھر صرف رات بسر کرنے کے لیے آتا تھا۔ کھانا وہ تنور پر کھاتا۔ مگر اصل مشکل اب پڑی جب اُسے دن رات کچے چھپر تلے اپنی نک چڑھی بہو کی نظروں کے سامنے رہنا پڑا جو عموماً اُسے کھانا دینا بھول جاتی تھی۔

اُس کا بیٹا کسی ہسپتال میں ملازم تھا۔ بارہ گھنٹے ڈیوٹی دے کر وہ رات کو گھر آتا۔ اس کی بیوی دوپہر میں کچے کوٹھے کی واحد کھڑکی میں بیٹھ کر اپنی بے سُری بھدی آواز میں فراق کے

ایت گاتی۔ معلوم نہیں وہ یہ گیت کس کے لیے گاتی تھی کیونکہ رات کو جب اُس کا شوہر گھر آتا تو تھوڑی دیر بعد ہی ان میں جوتم جوتا ہو جاتی۔ کبھی اُس کی تگڑی بیوی اپنے آدمی کے سینے پر چڑھ بیٹھتی اور کبھی اُس کا آدمی اُسے جھونٹوں سے گھسیٹ کر زمین پر دے مارتا۔ ایسے حالات میں وہ بچا کھچا کھانا، جو بیٹا ہسپتال سے لاتا تھا، مانگنے کی ہمت نہ پڑتی... ویسے بھی وہ سمجھتے تھے کہ اس کے پاس خاصی رقم ہے اور وہ باہر سے کھا کر خوش رہتا ہے۔

اگلی دوپہر میں جب وہ پھر کھڑکی میں سوار ہو کر گیت الاپتی تو وہ ایسے میں اس کی طرف چبھتی ہوئی گندی نظروں سے دیکھتا اور آئی توائی سوچتا۔ پھر اچانک وہ کپڑے کا گندا پرانا تھیلا کندھے پر رکھ کر باہر نکل جاتا۔ سڑک پر وہ تھکی چال چلتے کسی نہ کسی خالی پلاٹ کی طرف جا نکلتا اور وہاں لگے کوڑے کے ڈھیر کو پھرولنے لگتا۔ اس کوڑے میں سے اُسے کچھ کارآمد چیزیں مل جاتیں، مثلاً لوہے کا کوئی ٹکڑا، کاغذ، گتا، ٹوٹے شیشے، بوتلیں، سوکھی روٹیاں۔ وہ دن بھر یہ سب کچھ اکٹھا کرتا۔ یوں شام تک انہیں بیچ کر دو چار روپے بنا لیتا۔

'چٹی' سے اُس کی ملاقات بھی کوڑے کے ایک ڈھیر پر ہوئی تھی۔ کچھ دن پہلے اُس نے اسے دیکھا تھا۔

خوبصورت، بانکی، بھولی بھالی۔ یہ نام بھی اُس نے اسے دیا تھا حالانکہ وہ چٹی سے زیادہ بھوری تھی۔ بس بیچ بیچ میں کہیں سفید دھبے تھے۔ وہ اس وقت کوڑے کے ایک بڑے ڈھیر میں سے اپنے کام کی کوئی چیز تلاش کر رہا تھا۔ وہ کافی منہمک تھا جب وہ اچانک جھاڑی میں سے نمودار ہوئی اور اس پر بھونکنے لگی۔ وہ بڑے شدّ و مد سے بھونک رہی تھی جیسے اس کی صورت میں کوئی بڑا خطرہ دیکھ لیا ہو۔ اُس نے اس کے بھونکنے کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ صرف ایک بار اُس نے سر اُٹھا کر اُس کی طرف بے نیازی سے دیکھا اور منہ میں منمنایا تھا:

''چٹی تو بڑی سوہنی اور بانکی ہے۔ جا اپنے ٹھکانے پر چلی جا۔ تُو نہیں جانتی میں کون ہوں؟'' وہ زیرِ لب ہنسا تھا۔

کیسے کیسے بھیڑیا نما کتوں کا اُس نے صفایا کیا تھا اور کیسے کیسے انہیں پچھاڑا تھا۔ بس ایک رسّا اور ایک پڑیا... وہ کتوں کا جلاد تھا۔

وہ کچھ دیر بھونکتی رہی، تھوڑا آگے آ کر پھر تھوڑا پیچھے کو جا کر۔ جب وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹا

تو وہ تھک کر جھاڑی کے اندر چلی گئی۔ مگر کچھ ہی دیر بعد وہ سخت طیش اور غصے میں باہر آئی اور زور زور سے بھونکنے لگی۔ ظاہر ہے وہ اس کی آزادی میں مخل ہوا تھا۔

اُس نے بنا اس کی طرف دیکھے آہستہ سے کہا:

''جا چلی جا۔ نہ غصہ دلا مجھے۔'' اور وہ سچ مچ اندر چلی گئی اور اپنے پلّوں کے درمیان لیٹ کر غصے سے ہانپنے لگی۔

تب وہ آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا جھاڑی کے قریب آیا تھا۔ چوہوں جیسے چار پلّے ماں کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ ماں تیز غصیلی نظروں سے باہر دیکھ رہی تھی اور بے حد چوکنی تھی۔ وہ بڑی دیر چھپ کر انہیں دیکھتا رہا... ایک عجیب دلچسپی اور توجہ کے ساتھ... اُسے خواہ مخواہ ہی اس پتلی نوکیلی سلاخ کا خیال آیا جو وہ دفتر میں بھول آیا تھا۔

اگلے روز وہ اپنے جھونپڑے سے نکلا تو بلا ارادہ وہ چوک تک آ گیا اور لوگوں کے ہجوم میں سرکتا ہوا ایک قصائی کی دکان پر جا کھڑا ہوا۔ قطار کے آخر میں وہ احمقوں کی طرح کافی دیر کھڑا قصائی کی طرف دیکھتا رہا۔ جب بھیڑ کم ہوگئی تو بالآخر قصائی نے چھرا صاف کرتے ہوئے اُس پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے عاجزانہ انداز میں جھکا کھڑا تھا۔ قصائی نے بنا کچھ کہے چھیچھڑوں کے ڈھیر سے مٹھی بھر چھیچھڑے اُٹھا کر اُس کی طرف پھینکے۔ اُس نے فوراً ہاتھ آگے بڑھا دیے۔ پھر بھی چند چھیچھڑے اُس کی ہتھیلی کو چھوتے نیچے جا گرے جنہیں اُس نے فوراً جھک کر اُٹھا لیا۔

وہ واپس اسی جگہ پر آیا اور عین موقع پر آیا۔ چتّی کوڑے کے ڈھیر میں سے کچھ تلاش کر رہی تھی۔

''سوکھی ہڈیاں چبا کر کیا خاک دودھ پلاتی ہوگی۔'' اُس نے چھیچھڑے آگے کر دیے۔ چتّی ذرا چونکی، تھوڑا غرّائی، مگر جب اُس نے اُسے پچکارا تو وہ قدرے پس و پیش کے بعد چھیچھڑے کھانے لگی۔ کھانے کے دوران وہ دُم ہلا ہلا کر اُسے بھی دیکھتی جاتی تھی۔ چھیچھڑے کھا کر وہ فوراً جھاڑی کے اندر چلی گئی۔ وہ باہر سے چھپ کر پلّوں کو دیکھتا رہا۔ اُس کے روکھے سرد چہرے کی سلوٹوں میں ایک بے معلوم سی مسکراہٹ تھی۔

اس وقت اُسے یوں لگا جیسے وہ کسی نئی نوکری پر بحال ہوگیا ہے جہاں نفرت کی بجائے

محبت کرنے کے لیے ایک وجود بھی موجود ہے۔

چنّی اس سے جلد مانوس ہو گئی اور اس کے لیے پِلّوں تک پہنچنا بھی مشکل نہ رہا۔ وہ آرام سے جھاڑی میں ہاتھ ڈال کر انہیں اُٹھا لیتا۔

چنّی اب خوش اور اس کی طرف سے مطمئن تھی۔ وہ ان کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ وہ دم ہلا ہلا کر اُس کا شکریہ ادا کرتی۔ اب وہ دن کا کچھ حصہ کوڑے کے ڈھیر پر اور کچھ حصہ چنّی کے ساتھ گزارتا۔ وہ سوئے ہوئے پلّوں کو تھپکتا۔ پیار سے ان کے کان مروڑتا۔ جب وہ چیاؤں چیاؤں کرتے تو وہ بھی چیاؤں چیاؤں کرنے لگتا... سلاخ کا خیال اُس کے ذہن سے نکل گیا تھا...

جب جھاڑی پر دھوپ آ جاتی تو عموماً چنّی ایک ایک پلّے کو اُٹھا کر سایہ دار جھاڑی میں لے جاتی۔ جب تک وہ منہ میں دبا کر ایک پلّے کو اُٹھاتی وہ دوسرے پلّوں کو اُٹھا کر وہاں پہنچا دیتا۔ چنّی ایک آدھ زبان اُس کے منہ پر بھی پھیر دیتی... اور وہ کھی کھی ہنسنے لگتا۔ اُس نے ایک پھٹا پرانا ٹاٹ بھی کہیں سے لا کر جھاڑی کے اندر بچھا دیا تھا۔ پہلے تو چنّی کچھ مشکوک سی ہوئی، ٹاٹ کو بار بار سونگھا اور پھر اس کی طرف دیکھا جیسے تسلی کرنا چاہتی ہو اور جب اُس نے اُس کی پشت پر ہاتھ پھیرا تو وہ مطمئن ہو گئی۔

گوشت کھانا اُس کے نصیب میں نہیں تھا مگر وہ چھیچھڑوں کے لیے قصائی کی دوکان پر ضرور جاتا... دھڑکتا، پھڑکتا، دھواں چھوڑتا لٹکا ہوا گوشت۔ وہ اپنی بھوکی ندیدی آنکھوں سے یہ سب دیکھتا۔ مگر یہ اس کا نصیب نہیں تھا۔ وہ صرف قطار کے آخر میں چھیچھڑوں کے انتظار میں دیر تک کھڑا رہ سکتا تھا۔ وہ ٹھنڈی سانسوں کے درمیان یہ چھیچھڑے چنّی کو ڈال دیتا۔ اُس میں اور چنّی میں صرف چار ٹانگوں کا فرق تھا ورنہ اُس کی زندگی چنّی کی طرح سے ہی گزری تھی... روکھا سوکھا کھاتے اور دوسروں کے سامنے دم ہلاتے۔ بلکہ کچھ باتوں میں چنّی اس سے بہتر تھی۔ چنّی جب چھیچھڑے کھانے میں مصروف ہو جاتی تو وہ بچوں کو گود میں اُٹھا لیتا۔ اُن کے گرم نرم دھڑکتے وجود کو اپنے ساتھ لپٹاتا اور جب وہ اس میں دودھ تلاش کرنے لگتے تو اُسے گدگدی ہونے لگتی اور وہ بے اختیار کِھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ کبھی اُس کا جی چاہتا وہ بھی چنّی کی طرح چاروں ہاتھ پیروں پر کھڑا ہو جائے۔ ایسے میں اگر چنّی اندر آ کر لیٹ جاتی اور ہولے

ہولے آواز نکال کر پلّوں کو بلاتی اور وہ بھی اس کی گود سے لڑھک کر ماں کے پاس چلے جاتے تو اُسے یہ اچھا نہ لگتا۔ اُسے چٹی پر غصہ آنے لگتا۔ اس کا دل چاہتا سلاخ لا کر چٹی کو چھید ڈالے۔ وہ کچھ دیر وہاں رُکا اُسے سرد نظروں سے گھورتا رہتا پھر سر جھکا کر کوڑے کے ڈھیر کی طرف چلا جاتا۔

ایک دن وہ گھر سے نکلا تو کشاں کشاں پرانے دفتر جا پہنچا۔ وہ صاحب کے کمرے کے بند دروازے پر بہت دیر ہراساں سا کھڑا رہا۔ کئی ایک نے اُسے پہچان لیا اور تمسخر سے اُس پر آوازے کسے:

''اوئے، تو پھر آ گیا ہے! بات کیا ہے؟''

''اب کس چیز پر ہاتھ صاف کرنا ہے؟''

''میں بھی کہوں آج دفتر میں یہ کیسی جانی پہچانی سی بُو پھیل رہی ہے۔ اچھا تو یہ تم تھے؟''

''اوئے منحوس، اب تو کبھی نہا لیا کرو۔''

وہ منہ لٹکائے چپ کھڑا ہاتھ مروڑتا رہا حتیٰ کہ صاحب نے اُسے اندر آنے کو کہا۔

''کیا حال ہے بھئی، ٹھیک تو ہو۔''

''صاحب جی... کوئی کام دلوادیں... بڑی مشکل میں ہوں۔''

''کام...؟ اب کون سا کام کرو گے؟''

''سب کر لوں گا جناب۔''

''اچھا... دیکھوں گا... فی الحال تو کوئی کام نہیں ہے۔''

''درخواست ہے صاحب جی۔''

''اچھا یاد آیا!! ایک کام تمہارے مطلب کا ہے، مگر شاید اب تم نہ کر پاؤ۔''

''کر لوں گا صاحب۔ برابر کر لوں گا۔''

''شہر میں کچھ حادثے ہو گئے ہیں۔ کتا مارنے کی مہم ہے۔ تمہیں تو اس میں خاص مہارت حاصل ہے۔''

اُس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''نہیں صاحب، یہ کام اب مجھ سے نہیں ہو گا۔''

''ارے کوئی پہلوانی دکھانی ہے؟ سو روپے فی کتا ملے گا۔''

''ہیں جی!'' اُس نے تھوک نگلا اور حیرت سے منہ لٹکائے کھڑا رہا۔

''ہاں اب وہ دس روپوں والی بات نہیں ہے۔ اچھا اب تم جاؤ۔ سوچ لینا۔''

''جی جناب۔'' وہ وہاں سے مایوس لوٹ آیا۔

اب اتنے دنوں بعد یہ بھاگ دوڑ کا کام کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ زہر کھلا کر کتے کی چوکسی کرنا۔ تگڑا کتا مشکوک ہو کر جھپٹ پڑے تو تکا بوٹی اُڑا دے۔ اب اس میں وہ حیوانی طاقت نہیں رہی تھی۔ اس دن وہ اندر سے بڑا اداس اور مایوس تھا۔ اُسے تسلی اور تشفی کی ضرورت تھی۔ کوئی تو اس بھری دنیا میں اُس کے آنسو پونچھنے والا ہوتا۔ شام کو وہ جھاڑی کی طرف گیا۔ وہ ان حیوانوں کے ساتھ اپنا غم بانٹنا چاہتا تھا۔ جھاڑی میں ماں کے ساتھ چمٹے بچے سو رہے تھے۔ اُس نے انہیں اُٹھانے کے لیے جیسے ہی ہاتھ بڑھایا، چٹی نے تنی ہوئی گردن کے ساتھ کچھ اس طرح سر نہوڑا کر اُس کی طرف دیکھا اور ہلکا سا غرّائی کہ اُس نے فوراً ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس وقت انہیں چھیڑنا مناسب نہ تھا۔ اس کے اندر دھول سی بھر گئی۔ چٹی بھی مطلبی نکلی۔ وہ بجھے دل کے ساتھ واپس پلٹ آیا۔ راستے میں اُس کے پاؤں اوندھے سیدھے پڑتے رہے اور سر گھومتا رہا۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس رات وہ کھاٹ پر لیٹا کھلے آسمان کو تکتا رہا۔ وہ عجیب گھمن گھیریوں میں پڑا تھا۔ چٹی کی ذرا سی بے اعتنائی نے اُس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے۔ اُس نے چٹی کے لیے کیا نہیں کیا تھا۔ پہروں قصائی کی دوکان پر عاجزوں کی طرح ایک مٹھی بھر چھیچھڑوں کے لیے کھڑا رہا تھا۔ اُس کا دل چاہا سلاخ سے چٹی کو چھید ڈالے مگر وہ کتنی جوان اور خوبصورت تھی، پھر اُس کے بچے! کچھ شدید قسم کے جذبات... غصہ، نفرت، محبت، حسد، رقابت، سب گڈمڈ، ایک گمبھیرتا کے ساتھ آپس میں برسرِ پیکار تھے جیسے دو مدِ مقابل کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے زور آزمائی کر رہے ہوں۔ ہاں اور نہ کے بیچ میں وہ پھنسا تھا مگر فیصلہ تو بہرحال اُسے ہی کرنا تھا۔ اُس کے اندر کا غصیلہ جن بار بار باہر آنے کو ہوتا جسے وہ اندر کو دھکیل رہا تھا۔ نہیں... نہیں... وہ سر جھٹک رہا تھا۔ ذہن اور دل کی اس جنگ نے اُسے تھکا کر بالکل نڈھال کر دیا۔ بالآخر وہ سو گیا۔

صبح جب وہ اُٹھا تو اس کے اندر سب کچھ بدل گیا تھا۔ وہ سیدھا چوک کی طرف نکلا چلا

گیا۔ وہاں سے کچھ چھیچھڑے اور تھوڑا سا دودھ لیا۔ دودھ کو مٹی کی کونڈی میں ڈالا۔ چھونپڑی میں رکھے موٹے رسے کو جھاڑ کر اُٹھایا اور اب وہ وہاں تھا۔ کسی مٹی کے پُتلے کی طرح بالکل خالی، سپاٹ، بے حس... اُس نے خود کو چھپائے ہوئے جھاڑی کے اندر جھانکا۔ چنّی کے جسم کا تھوڑا سا حصہ اُسے دکھائی دے رہا تھا۔لیکن اندر سے چنّی نے اُسے اس کے جھکے ہوئے پورے وجود کے ساتھ دیکھا...لٹکا ہوا گرد آلود چہرہ، میلے اَٹنگے کپڑے، پھٹے ہوئے جوتے میں گندے گرد آلود پاؤں، مچی مچی غلیظ آنکھیں، بڑھی ہوئی داڑھی کے کھچڑی سے کھڑے بال، بدہیئت، بدشکل، بدبودار۔ وہ چپکے چپکے اسے جھاڑی میں تلاش کر رہا تھا۔ چنّی کو اس کی ظاہری حالت سے کیا لینا دینا تھا۔ اس کے لیے تو خوبصورتی کا پیمانہ اندر کا تھا۔ وہ بڑی محبت اور شکر گزاری سے اُسے دیکھ کر ہولے ہولے آنکھیں جھپکا رہی تھی۔ وہ یقیناً اُس کی احسان مند تھی۔ وہ کافی دنوں سے اُس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ ایک بار اُس نے اپنی زمین پر پڑی دم کو بھی ہلایا۔ شک کی تو گنجائش نہیں تھی۔ وہ اس کی شکر گزار تھی اور انسان کے ہر دم بدلتے روپ سے بے خبر۔ وہ روزانہ بے دھڑک بچوں کو جھاڑی سے اُٹھالیتا تھا۔ انہیں اپنی گندی جھولی میں بٹھا کر پیار کرتا۔ اپنا گندہ منہ ان کے منہ کے ساتھ رگڑتا اور بہت سی سمجھ نہ آنے والی باتیں اُن کے ساتھ کرتا اور وہ بالکل مطمئن دم ہلاتے اُسے دیکھتی رہتی اور اس کی لمبی کالی آنکھیں احسان مندی سے بھری رہتیں۔

اچانک اُس نے چنّی کے کچھ چھپے اور کچھ ظاہر وجود کو دیکھ لیا۔ بچے اُس کے ساتھ چمٹے دودھ پی رہے تھے۔ چسر چسر کی ہلکی سی آواز تھی۔ اس وقت انہیں دیکھ کر اُس نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔ کسی اجنبی کی طرح کورا دل لیے وہ وہاں کھڑا تھا۔ پہلے وہ ذرا سا جھجھکا اور ٹھٹھک کر رکا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ اندر سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ لیکن جیسے ہی اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اُس کی چوڑی آنکھوں سے ٹکرائیں وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹ گیا۔ اُس کے دل میں چور تھا۔ اُس نے چھیچھڑے اور دودھ کی کونڈی تھوڑے فاصلے پر رکھ دی۔ اب اُسے تھوڑا سا انتظار کرنا تھا، جب تک وہ دودھ پلا کر فارغ ہو جاتی۔ یقیناً بچے بھوکے تھے۔ مگر وہ بھی تو بھوکا تھا۔ سرخ نوٹ اُس کی آنکھوں کے سامنے لہرا رہا تھا۔ اب اُس کے لیے مزید انتظار اور صبر کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اُس نے سفوف دودھ میں ملایا اور خود ذرا دور ہٹ کر منہ سے

’’پچ پچ‘‘ کی آواز نکالی۔ چھیچھڑوں اور دودھ کی ملی جلی مہک ہوا کی لہروں کے ساتھ چٹی کے ناک تک پہنچ رہی تھی۔ دودھ کی مہک تو بہت دنوں بعد اُس کی قوتِ شامہ سے ٹکرائی تھی۔ کتنے بہت دنوں سے اُس نے دودھ نہیں چکھا تھا۔ اُس کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ اُس نے اپنی لمبی زبان نکال کر ہونٹ چاٹے اور جھٹکا مار کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بچوں کو اُس نے پیچھے دھکیل دیا۔ بھوکے بچے چیاؤں چیاؤں کرتے ایک دوسرے میں گھس کر دودھ ٹٹولنے لگے۔

وہ باہر آئی اور چھیچھڑوں پر پل پڑی۔ چھیچھڑے کھا کر اُس نے بڑے سکون سے دو پاؤں آگے اور دو پاؤں پیچھے کر کے لمبی انگڑائی لی اور زبان سے خود کو چاٹا...کوئی شک شبہے والی بات نہیں تھی۔ اب وہ اِدھر اُدھر سونگھنے لگی۔ غالباً دودھ کا سراغ لگانا چاہتی تھی۔ تبھی اُس نے چٹی کو پچ پچ کر کے بلایا۔ اُس کے منحوس چہرے پر مکر پنے کی ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اُس نے ہاتھ سے اُس کی پیٹھ تھپکی اور دودھ کی کونڈی آگے کو کھسکا دی۔ خود تھوڑا پیچھے کو ہٹ گیا۔ چٹی نے کونڈی میں منہ ڈالا اور لپ لپ تھوڑا سا دودھ پیا۔ پھر سر اُٹھا کر اُس کا جائزہ لیا، تھوڑے فکر و تردد کا اظہار کیا جیسے کسی شک میں پڑ گئی ہو۔ مگر وہ اس پر کیسے شک کر سکتی تھی! ایک بھروسے کے ساتھ اُس نے دوبارہ کونڈی میں منہ ڈالا لیکن چند ایک بار لپ لپ کرنے کے بعد دودھ چھوڑ دیا۔ وہ خاصی متردد نظر آ رہی تھی۔ اُس نے ایک دو بار سر کو جھٹکا، کان پھڑ پھڑائے، تھوتھنی کو زمین پر رگڑا...وہ کچھ ٹھیک محسوس نہیں کر رہی تھی۔ وہ اپنے پچھلے پیروں پر تھوڑا سا لڑکھڑائی مگر فوراً سنبھل کر شک بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ امید و بیم میں بڑی چوکسی سے اُس کا جائزہ لے رہا تھا۔ کہیں گڑبڑ نہ کر دے۔

’’پیو۔‘‘ اُس نے آہستہ مگر مضبوط کھردرے لہجے میں کہا اور اپنا ہاتھ اُسے تھپکنے کے لیے آگے بڑھایا مگر اب وہ پورے شک میں تھی۔ وہ ہلکا سا غرّائی اور اپنا پنجہ اُٹھا کر اس کے ہاتھ پر مارا۔ اُس کے ہاتھ پر کھرونچا لگا اور خون رِسنے لگا۔

’’بدذات، احسان فراموش، بدبخت۔‘‘ وہ غصے سے منمنایا۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اُس کی یہ مجال کہ وہ اس کے سامنے یوں کھڑی ہو گئی تھی۔ اُس نے اس کے لیے کیا نہیں کیا تھا!

اُس کے اندر کا کچلا مسلا انسان اچانک انگڑائی لے کر بے دار ہو گیا۔ برسوں کا دبا

ہوا غصہ، نفرت، احتجاج اس کی کند آنکھوں میں لہرا گیا۔ اُسے معلوم تھا مقابلے میں پہل کرنے والے کی جیت ہوتی ہے۔ اُس نے رسا گھما کر پوری طاقت سے اُس کے منہ پر مارا۔ ایک جانور کا مقابلہ دوسرے جانور سے تھا۔ اپنی بقاء کا مسئلہ تھا۔ اُس کا جیتنا لازمی تھا۔ وہ اُسے چیر پھاڑ بھی سکتی تھی۔ اب وہ مکمل سفاکی کی تصویر بن گیا تھا۔ وہ جھاڑی اور اس کے درمیان کھڑا ہوگیا۔ جھاڑی سے بھوکے بچوں کی چیاؤں چیاؤں کی آواز آ رہی تھی۔ اُس نے گویا کچھ سنا ہی نہیں۔

چٹّی نے اپنا رُخ بدلا جیسے وہ جھاڑی میں جانے کا فیصلہ کر رہی ہو مگر وہ اُسے یہ موقع کسی حالت میں نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُس نے رسا گھمایا اور دوسرا وار کیا۔ اچانک وہ اُچھلی اور ایک دردناک کرلاہٹ نے ایک طرف کو بھاگی۔ خوف سے اُس کے نوکیلے کان پھڑک رہے تھے۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھونچکا سا رہ گیا۔ پھر کسی درندے کی طرح اُس پر جھپٹا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ زیادہ تیز نہ بھاگ سکے گی اور وہ اپنی مہارت اور تجربے کی بنا پر اُسے جلد گھیر لے گا۔ اب اس کے چہرے پر وہی خونخواری اور سفاکی تھی جو کسی بھی شکار پر جھپٹتے درندے کے چہرے پر ہوسکتی ہے۔ وہ کسی حیوانی جبلّت کے تحت اس پر لپکا۔ موٹے رسے کے ایک سرے پر پھندا تھا جسے وہ گھما رہا تھا۔ وہ اسے تھکا کر ادھ مؤا کر دینا چاہتا تھا تاکہ اگلا مرحلہ آسانی سے طے ہوجائے۔

وہ دونوں آندھی اور طوفان کی مانند پلاٹ سے نکلے۔ چٹّی آگے تھی اور وہ رسا گھماتا پیچھے۔ اچانک بھڑک آنے والی پیاس سے چٹّی کی زبان باہر نکل پڑی تھی...ابھی پہلا جھول دیا تھا کہ یہ مصیبت آن پڑی۔

جب دونوں گلی میں سے دھڑ دھڑاتے ہوئے گزرے تو گلی میں کھیلنے والے بچے گھبرا کر گھروں میں گھس گئے۔ کئی راہگیروں نے سر گھما کر اس عجیب تماشے کو حیرت سے دیکھا۔ دونوں بنا توجہ دیے بھاگتے چلے گئے۔ دونوں ہانپ رہے تھے۔ دونوں کے منہ سے کف جاری تھا۔ اُس کا اندازہ غلط تھا۔ چٹّی اُسی رفتار سے جا رہی تھی اور اُسے غصہ اور طیش آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سچ مچ خون اُتر آیا۔ ایک خدشہ بھی تھا...جوان تھی کہیں ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ وہ پوری طاقت سے اُس کے پیچھے تھا۔ اُسے صرف اُس کے گرنے کا انتظار تھا۔

چٹی کی آنکھوں میں خوف اور مایوسی تھی۔ اب وہ لڑکھڑانے لگی تھی مگر بار بار سنبھل جاتی۔ کئی بار اُس نے کسی گھر میں گھسنے کی کوشش کی مگر ہر بار بند دروازے سے اُس کا سر ٹکرا کر رہ گیا۔ پے در پے چوٹ لگنے سے اس کا سر جھنجھنا اُٹھا تھا اور آنکھوں تلے اندھیرا آ رہا تھا۔ کوچہ بہ کوچہ، گلی در گلی یہ دوڑ جاری تھی۔ بار بار وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی۔ پھر وہ رُک کر راستے کا جائزہ لیتا، ناک کے نتھنے پھڑکتے، وہ فضا میں سونگھتا اور پھر اُس کی بُو محسوس کر کے اُسی سمت میں بھاگتا۔ یہ سارے تجربے اُس نے زندگی بھر میں حاصل کیے تھے۔ وہ کتے کی بُو کو خوب پہچانتا تھا۔ وہ فاصلے کا اندازہ بھی ٹھیک ٹھیک کر رہا تھا جو آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔ اُس کی کامیابی یقینی تھی۔ اُسے معلوم تھا چٹی کو گھوم پھر کر پھر اپنی جگہ پر آنا تھا۔ بے خبر چٹی اب نڈھال ہو چکی تھی۔ اُسے اتنی بڑی کائنات کے اندر صرف ایک کونا درکار تھا جہاں وہ اپنی جان کی امان چاہ سکتی۔ وہ پیاسی بھی تھی۔ اس کے کانپتے ڈھیتے جسم کو پانی کی اشد ضرورت تھی۔ اُس کی حیوانی عقل کے مطابق اگر اُسے اس وقت پانی مل جاتا تو وہ بالکل ٹھیک ہو جاتی۔ یہ بات وہ بھی جانتا تھا اس لیے کسی بلا کی طرح اس کے پیچھے تھا۔ ایک جگہ کھڑے پانی کو دیکھ کر اُس نے رکنے کی کوشش کی مگر اُس نے اُسے رکنے نہیں دیا۔ وہ رسا گھماتا اُس کے قریب آ گیا۔ وہ پھر بھاگی۔ وہ اُسے یہ مہلت دینے کو تیار نہیں تھا ورنہ سارا کھیل بگڑ جاتا۔

بھری دوپہر میں گھروں کے دروازے بند تھے۔ اب اُس کے اندر کچھ بھی نہیں بچا تھا... نہ ہمت، نہ طاقت، نہ جرأت۔ اچانک ایک دروازہ کھلا دیکھ کر وہ زن سے اندر داخل ہو گئی اور زینے کے نیچے ایک کونے سے میں پڑے کاٹھ کباڑ میں چھپ گئی۔

اُس کی پتلی کانپتی دم اُس کی ٹانگوں کے بیچ میں تھی۔ آنکھوں میں موت کی زردی تھی۔ اس کی بند ہوتی آنکھیں باہر کی طرف لگی تھیں۔ وہ اس کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

اور وہ باہر سے اس کے چھپے ہوئے وجود کی تلاش میں تھا۔ اُسے ہر حالت میں اُس کی درگت بنانا تھی۔ وہ اس کے ساتھ پرانا بلی چوہے والا کھیل کھیل رہا تھا۔

دونوں کے حلق خشک تھے اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ چٹی کی کھردری زبان نیچے لٹک رہی تھی۔ اس زبان سے اُس نے کئی بار اُس کے غلیظ منہ کو چاٹا تھا۔ کونڈی میں منہ ڈالتے ہی اُسے شک پڑ گیا تھا اور اُس نے حیرت سے منہ اُٹھا کر اُسے دیکھا تھا اور اب وہ

اس دگرگوں حالت میں پیاسی، نیم مردہ وہاں موجود تھی۔ وہ کچھ دیر وہاں رُکی ہانپتی رہی۔ اُسے زور کا چکر آ رہا تھا اور طبیعت بگڑ رہی تھی۔ وہ واپس جھاڑی میں اپنے بچوں کے پاس جانا چاہتی تھی۔ اب اُس کے منہ سے سبزی مائل پانی بہہ رہا تھا۔

اچانک وہ باہر نکلی۔ وہ وہاں موجود تھا۔ اُس نے رسا گھما کر اُس کا رُخ موڑا۔ وہ دوڑی مگر اب کمزوری اُس پر غالب آ چکی تھی۔ وہ پھر اسی پلاٹ کی طرف آ رہے تھے۔

سامنے جھاڑی پر تیز دھوپ آ چکی تھی۔ جھاڑی کے اندر جھلستے بچے دردناک آواز میں کرلا رہے تھے۔ ایک، جو سب سے چھوٹا تھا، لڑکھڑاتا جھاڑی سے تھوڑا باہر آ گیا تھا۔

اُس نے دھندلی آنکھوں سے خطرے میں گھرے اپنے بچے کو دیکھا۔ اُس کا حیوانی دل بچے کو دیکھ کر تڑپ اُٹھا اور اپنی مصیبت بھول گیا۔

اُس نے ایک آخری کوشش کی کہ وہ آگے بڑھ کر جھاڑی میں گھس جائے مگر تبھی پھندے والے سرے کو اُس نے چتّی کی طرف پھینکا جو اس کے گلے میں پڑتے ہی تنگ ہو گیا۔ اُس نے پوری طاقت سے رسّا کھینچا۔ اچانک چتّی کے پاؤں زمین سے اُکھڑ گئے۔ وہ کسی کھلونے کی طرح زمین سے بلند ہوئی اور کسی لٹو کی طرح فضا میں گھومنے لگی۔ وہ اُسے اپنی پوری طاقت سے گھما رہا تھا۔ چتّی کے حواس بالکل گم ہو گئے تھے۔ اُسے اپنے آپ پر کوئی قابو نہیں رہا تھا۔ تیسرے ہی چکر میں اُس کی آنکھیں پھر گئیں، جسم ڈھیلا پڑ کر وزنی ہو گیا۔ تبھی ایک آخری زور کا چکر دے کر اُس نے رسا ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ وہ دور دھپ سے مٹی کے ڈھیر پر جا گری۔

وہ خود بھی زمین پر بیٹھ گیا۔ اُس کا سانس پھولا ہوا تھا، چہرے سے خشونت ٹپک رہی تھی اور آنکھوں میں غصہ اور قہر تھا۔ اُسے یقین نہیں تھا کہ چتّی یوں خم ٹھونک کر سامنے کھڑی ہو جائے گی۔

''بدذات، کمینی، میسنی۔'' وہ منہ میں بڑبڑایا۔

اُس نے ایک سرد، بے تعلق نظر سامنے دھوپ میں جھلستی جھاڑی اور خطرے میں گھرے بچے پر ڈالی پھر آہستہ آہستہ رسا لپیٹنے لگا۔

کمبل کا سوراخ

نچلے ہونٹ کو ذرا سا دبا کر جب اُس نے اپنی کٹارہ سی آنکھوں کے ساتھ سراج کی طرف دیکھا تو وہ کھڑے کا کھڑا ہی رہ گیا۔ اُسے لگا جیسے اُس کا دل واقعتاً اپنی جگہ سے ہل کر کہیں اور جا پڑا ہے۔

دفتر میں اُس کا یہ پہلا دن تھا اور اُس نے سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے محض جان کاری کے لیے پورے ائیر کنڈیشنڈ ہال پر نظر ڈالی تھی۔ آئینے کی طرح چمکتے چکنے فرش سے کرسیوں، میزوں پر سے ہوتی ہوئی اُس کی نظر وہاں تک پہنچی ہی تھی کہ پھندے کی طرح وہ اُس کی نظروں میں اُلجھ کر رہ گیا۔ وہ اُس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اُس کی نظریں بھی اُسی پر ٹکی تھیں... کسی پرانی پہچان کی طرح۔ تبھی آدھے کچے، آدھے پکے بالوں والے کبیر نے بال پوائنٹ سے میز کو کھڑکھڑایا:

''انتالیس سال عمر ہے اُس کی... بالی ہی سمجھو۔'' وہ اپنی گھنی کالی چٹی مونچھوں میں ہنسا۔ شادی اور طلاق، دونوں تجربے حاصل کر چکی ہے۔ اب دوسرے مرد کا تجربہ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لیے انسانی ہستی کی مکمل تکمیل کے لیے نت نئے تجربے کرتے رہنا بڑا ضروری ہے۔ سگریٹ پیتی ہے، سلام کرو تو ہاتھ بڑھاتی ہے، FX پر آتی جاتی ہے، بڑی بدذات شے ہے۔ تمہارے مطلب کی نہیں، بیٹھ جاؤ، ورنہ تنکے کی طرح اُس کے گرد گھمن گھیریاں کھاتے پھرو گے اور کہیں پناہ نہیں ملے گی...... ویسے کس گاؤں کے ہو میاں۔۔۔؟؟''

اُس نے اس فضول بات کو اَن سنا کر دیا اور اُس کی طرف دیکھتا رہا... چاندی جیسا رنگ، جس میں ہلکی سی تانبے کی ملاوٹ کر دی گئی ہو، اوپر کے دانت تھوڑا اونچے، تیز میک اپ،

بھورے بال، اسی شیڈ کا لباس...لباس میں نفاست اور نیا پن، نظر میں پختگی اور اعتماد۔

سراج بھونچکا سا بیٹھ گیا...

مگر اُس نے کالا چشمہ لگا کر دوبارہ اُسے دیکھا...

''واہ! کیا اسٹائل مارا تھا ظالم نے۔''

وہ اس قسم کی سفلی باتیں کم ہی سوچتا تھا۔ مگر اس وقت، اُس کا دل چاہا، جتنی بھی دیگر قسم کی سوچیں ہیں سب اس کے پسپا ہوتے دل و دماغ میں اکٹھی ہو جائیں۔ اس وقت یوں سوچنے میں ایک مزا سا تھا اور جب اُس نے ہلکی تیکھی مسکراہٹ کے ساتھ ڈبیا سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی تو وہ بِنا سوچے سمجھے لائیٹر لے کر اس کی طرف بڑھا۔

''تھینکس مسٹر''

اُس نے کالے چشمے کے اندر سے بہت قریب سے اُس کا جائزہ لیا... بالکل آمنے سامنے، نزدیک سے... انتالیس سال... مگر بڑھاپا کس سپاٹ (Spot) سے شروع ہونے والا تھا... کہیں سے بھی نہیں... اُس کی جلد بچے کے جیسی نرم اور ہموار تھی۔ شاید کچے پکے بالوں والا دروغ گو تھا۔ کچھ لوگ محض دور سے، گویا سونگھ کر عورت کی عمر بتا دیتے ہیں... نجومی طوطے کے طرح۔

''سنبل!''... اُس نے ہاتھ بڑھایا۔

''سراج!''... ذہن کی بند کھڑکی کھٹاک سے کھل گئی۔ دونوں ہنس پڑے۔

''کیسے ہو... بیٹھو...'' اُس نے بڑے مدبرانہ لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہوں۔ ابھی چلتا ہوں، لنچ ٹائم پر ملتے ہیں۔ ٹفن ساتھ لایا ہوں۔ آلو کے پراٹھے اور پودینے کی چٹنی، ہے نا مزے کی چیز۔''

''بالکل بھی نہیں۔'' وہ ہنس پڑی۔

''میں تو ڈائیٹ پر رہتی ہوں۔ آلو تو بالکل نہیں لیتی۔ بس ہلکے پھلکے چپس، بران بریڈ، انڈے کی سفیدی اور پھیکی چائے... ہاں... 'کافی' شوق سے پیتی ہوں... 'کالی کافی' بغیر چینی کے۔''

O

پچا دین محمد نے بڑے فخر سے انگلی ہلائی تھی:

''یہ سراج ہے۔''

بھلا یہ کون سی نئی بات تھی۔ دین محمد اور سراج یہ دونوں نام تو برسوں سے اُس گھر میں سنائی دے رہے تھے۔

''تو؟'' وہ اپنے کام میں جتی رہی... دادی جانے اور وہ دونوں۔

''یہ ادھر لاہور ہی میں ہوتا ہے۔'' دین محمد بھی اُسے چونکا دینے پر مصر تھا۔

اُس نے لفظ لفظ پر زور دے کر کہا:

''اوئے بتا نہ کیا پڑھ رہا ہے۔''

''MBA کر رہا ہوں۔''

اب کے وہ چونکی اور حیران ہو کر اس نے نظریں اُٹھائیں۔ دین محمد تو وہ پہلے والا دین محمد ہی نہ تھا۔ لٹھے کی کھڑ کھڑاتی سفید شلوار قمیض میں وہ خاصا مد بر سا دکھائی دے رہا تھا۔ رنگ روپ بھی نکھرا ہوا تھا... اور سراج... اونچا، لمبا، سمارٹ سا منڈا۔

''ارے یہ کیسا انقلاب ہے برخوردار؟'' وہ کہنے والی تھی...

مگر اُس کو یوں اپنے اوپر تاڑ کی طرح کھڑا دیکھ کر کچھ نہ کہہ سکی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا دبدبہ اور تنبیہہ تھی۔ وہ تلملا سی گئی۔

'چھچھورا، سفلہ... کس کو دبانے آیا ہے... کفوں سے ناک پونچھتے کتنے دن ہوئے۔'

وہ پھر سے اپنے ضروری کام میں مصروف ہو گئی۔

''اوبے وقوفا باجی کو سلام کر۔'' دین محمد اُس کی جان چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔

اُس نے اپنا سفید لمبی انگلیوں والا ہاتھ ہلایا...

''ہیلو۔''

''ہیلو...'' اُس نے بھی دو اُنگلیاں اُٹھا کر اُس کے سلام کو قبول کیا۔

''بس ٹھیک ہے بھئی۔'' اُس نے بالکل نارمل انداز میں کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو اور کوئی بات تھی بھی نہیں۔ بس اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا کہ وہ تلملا گئی... چھوٹے پن کی یہی مصیبت ہے۔

چند ایکڑ زمین دین محمد کو ٹھیکے پر دے کر دادی نے مصیبت مول لے لی تھی۔ وہ جب بھی روپے پیسے دینے میں دیر سویر کرتا، دادی اُسے پوسٹ کارڈ لکھواتیں۔ بغیر کسی رسمی بات کے وہ فوراً ہی جھاڑ جھپاڑ شروع کر دیتیں۔ دادی جل جل کر جو لکھواتیں، وہ لکھے جاتی۔ مگر اندر سے اُسے بڑا ترس آتا۔ اُسے دادی کی یہ باتیں بالکل اچھی نہیں لگتی تھیں۔ چھوٹا سا بھولا بھالا 'سرجو' بھلا اُس کا کیا قصور تھا جو دادی اُسے گالیاں دیتی تھی اور چچا دین محمد تو اُسے بالکل اپنے چچا جیسا لگتا۔ دادی کی گالیوں کے بعد وہ ہمیشہ گویا اشک شوئی کے لیے کچھ جملے اپنی طرف سے بھی لکھ دیتی۔ مثلاً دین محمد کو وہ ہمیشہ چچا دین محمد لکھتی اور آخر میں اُسے سلام اور سرجو کو پیار لکھنا نہ بھولتی... اور اضافی جملہ بھی ہمیشہ لکھتی...

''چچا! سرجو کو اسکول ضرور بھیجنا، پھر دیکھنا اسے اس قسم کے فضول پوسٹ کارڈ کبھی نہیں آئیں گے''... وغیرہ وغیرہ۔ ایک بار تو اُس نے چوری چوری یہ بھی لکھ دیا کہ چچا اگلی بار مجھے خط میں اپنا اور سرجو کا فوٹو ضرور بھیجنا دادی کا یہ روّیہ اُسے بہت کھٹکتا تھا، مگر دین چچا بھی عجیب آدمی تھا، جو یہ سب کچھ، ساری لعن طعن خاموشی سے برداشت کر جاتا۔ وہ اپنے جوابی پوسٹ کارڈ میں بہت ہی حقیر فقیر سا انسان نظر آتا۔ ہر گالی کے جواب میں وہ گھگھیاتا، ہاتھ جوڑتا، پیر پکڑتا...

''جوتے ماریں... بیمار تھا... فصل خراب ہوگئی تھی... ڈیرے دار نے پانی بند کر دیا تھا... کیڑا پڑ گیا... سنڈی سارا کچھ کھا گئی... ٹڈی دل نے تباہی مچا دی... سیلاب چڑھ آیا... چھپر گر گیا... وغیرہ وغیرہ... سو واویلے سناتا... آخر میں گویا اُس کو بتانے کے لیے لکھتا:

''سرجو کی بھی پڑھائی شروع ہوگئی ہے۔ پرائمری مدرسے میں ہے۔ اُس کا خرچ بھی پڑ گیا ہے۔ پھر بھی تھوڑا دانہ پھکا بھیج دوں گا، خاطر جمع رکھیں۔ اس بار دیر نہ ہوگی۔''

یہ سب سن کر دادی بالکل آگ بگولا ہو جاتی۔ مگر وہ سرجو کی پڑھائی کے خرچے کا پڑھ کر منہ ہی منہ میں بہت ہنستی۔ ان پوسٹ کارڈوں میں دین چچا اتنا چھوٹا سا لگتا... دو ٹکے سے بھی کم کا آدمی۔

اس دن دادی بہت غصے میں تھیں۔ پورے ایک سال سے ٹھیکے کی رقم وصول نہیں ہوئی تھی۔ زمین چند ایکڑ سہی، تھی تو ان کی ملکیت اور پھر وہ اس آمدن سے اپنے فالتو خرچ چلاتی

تھیں۔ ابا کے منع کرنے کے باوجود، وہ صبح ہی صبح وہاں جانے کو تیار ہو گئیں۔

''دفتر پہنچ کر گاڑی بھجوادوں گا۔'' ابا نے سمجھایا۔

مگر دادی غصے میں تھیں۔ صبح نماز تسبیح سے فارغ ہو کر انہوں نے جانے کی ٹھان لی تاکہ شام سے پہلے واپس آ جائیں۔

''میں بھی چلوں گی۔''

دادی کو تیار دیکھ کر وہ بھی جوتے پہن کر تیار ہو گئی۔ وہ دین چچا اور 'سرجو' سے ملنا چاہتی تھی۔

''ارے بابا مجھے تو پیدل جانا ہے۔''

''تو کیا ہوا؟''

''اچھا! شاید راستے میں کوئی بیل گاڑی مل جائے؟''

وہ ناشتہ تک بھول گئی... سفید بیل تو اُسے ہمیشہ سے مبہوت کر دیتے تھے۔

پتلی، سیدھی، صاف، تارکول پھری سڑک، کنارے کنارے پانی کی پکی نالیاں کھیتوں میں جاتیں، دائیں بائیں پھلوں کے باغ... آم، امرود، مالٹا، انار، جامن... طوطوں کی ڈاریں، شریف فاختائیں، خوبصورت نیل کنٹھ، مختلف رنگوں کی چڑیاں پانی کی نالیوں سے چونچوں میں پانی بھرتیں، اونچے درختوں پر کائیں کائیں کرتے کوے اور رکھوالے کی ہو ہو... یہ سب اس کے لیے حیران کن تھا۔ وہ ہکا بکا سی دادی کے ساتھ چل رہی تھی۔ اُس کے قدم پانی کی نالی کے ساتھ ساتھ پڑ رہے تھے۔ اچانک اُس کا دل چاہا، وہ اس صاف شفاف پانی میں ہاتھ پاؤں ڈال کر بیٹھ جائے اور بیٹھی رہے۔ اُس نے ایک لمبا سانس کھینچا۔

''دادی پیاس لگی ہے۔'' اُس نے محض رکنے کے بہانے سے کہا۔

''گھر سے نہیں پیا تھا۔''

''نہیں، میں نے تو ناشتہ بھی نہیں کیا۔ میں نے سوچا، دین چچا کے یہاں خوب مزے مزے کی چیزیں کھائیں گے۔''

''بے وقوف نہ ہو۔ اس پھکڑ کے پاس کیا ہے... ہولیں، مولیاں، بھٹے اور لسی... وہ بھی مکھن کے بغیر یا ساگ پات۔''

دادی بڑبڑاتے جا رہی تھیں۔ پھر ایک چھوٹی سی صاف ستھری مسجد آئی جس کے ساتھ ہی ایک کنواں بھی تھا اور اس کی چرخی سے لپٹا لال رنگ کا بوکا۔

''میں نکالوں گی پانی'' وہ کنوئیں کی طرف دوڑی۔

دادی نے اُس کا ہاتھ مروڑ ڈالا:

''مرنا ہے کیا؟ تمہارے باپ کو کیا جواب دوں گی؟''

چمڑے کے لج لج کرتے بوکے کو چھونے کی شدید خواہش سے اُس کے ہاتھ تھرتھرانے لگے۔ مگر دادی نے بوکا گڑم سے کنوئیں میں ڈال کر پانی کھینچا، چرخی گھومنے لگی، اُس نے چلو میں پانی بھر کر پیا... ٹھنڈا میٹھا پانی... ایسا پانی تو اُس نے کبھی نہیں پیا تھا۔

کچے کوٹھے میں دادی کا استقبال انکساری سے کیا گیا۔

''یہ سب ہمارا ہے۔'' دادی نے ہولے سے اُس کا ہاتھ دبا کر کہا۔

ایک عورت نے جلدی سے ایک لال رنگ کی چارپائی بچھا دی اور اُس پر چار خانے کا کھیس ڈال دیا۔

''بیٹھو بی بی! آج ہمارے بھاگ جاگے جو آپ آئیں۔'' دادی نے کچھ کہے بنا ناک سکیڑا، اور ماتھے پر سوبل ڈال کر بیٹھ گئیں۔

''کہاں ہے وہ؟ بلاؤ اُسے۔ آج سارا حساب کتاب کر کے جاؤں گی۔''

تانبے کے لمبے گلاسوں میں مکھن بھری لسی آ گئی۔

''نا بابا، میں نہ پیوں گی۔''

''بی بی جی دہیج کا گلاس ہے، صاف ستھرا کر کے لائی ہوں۔''

''نہ...... مجھ پر تو دین محمد کے گھر کا پانی بھی حرام۔ اِسے دے دو۔''

اُس نے تانبے کے لمبے گلاس کو ہونٹوں سے لگایا۔ تھوڑا سا پیا... لسی مزے کی تھی۔ اُس کا منہ جھاگ سے لتھڑ گیا۔ پاس کھڑی ایک لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اپنے گندے دوپٹے سے اُس کا منہ پونچھ دیا۔

تبھی دین چچا گھبرایا گھبرایا سا آیا۔

''سلام جی۔'' اور زمین پر دادی کے پاؤں کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''یہ کیسا تھا دین چچا؟''

وہ حیران رہ گئی اور اس حیرانی میں لسی پینا بھول گئی۔ اُس نے لمبا تانبے کا گلاس سٹول پر رکھ دیا۔

''ماں کے دہیج کا ہے۔'' لڑکی نے اُسے مزید حیران کرنے کے لیے بڑے فخر سے کہا۔

اُس نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ تو ایک بہت عجیب سا آدمی تھا اور وہ اس بے ڈھنگے آدمی کو چچا بنائے ہوئے تھی۔ اُس نے خوامخواہ ہی سمجھ لیا تھا کہ وہ ویسا ہوگا... چچا جیسا۔ اُس کا دل بجھ سا گیا۔ کالا سوکھا مریل سا، اٹنگی سی میلی دھوتی، اُجڑے بال، بے وقت کی جھریاں، مٹی میں سنے ہاتھ پاؤں، ہاتھوں پر اُبھری موٹی موٹی رگیں... یہ تھا اُس کا دین چچا، جس سے وہ غائبانہ محبت کرتی تھی... اور سراج... کچے کوٹھے کی دہلیز میں ایک اونگا بونگا چھوٹا سا لڑکا، لمبا سا چوغا پہنے، کُرتے کے لمبے لٹکتے بازو سے اپنی بہتی ناک رگڑ رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں چھڑی تھی۔

''ضرور بکریوں کے پیچھے ممیاتا پھرتا ہوگا، اور مٹی میں چھوٹے چھوٹے گڑھے کھود کر کنچے کھیلتا ہوگا۔''

اُسے بڑی گھٹن محسوس ہوئی۔ وہ کہاں اتنے غلیظ لوگوں میں آن پھنسی تھی۔ اُس کا دل چاہا اپنے ہاتھوں سے ان دونوں کو جوتے لگائے۔ یہ کمبخت آخر ایسے کیوں تھے؟

''چلو دادی واپس چلو۔'' وہ رنگین پلنگ سے چھلانگ لگا کر نیچے اُتر پڑی تھی۔

اُس دن کے بعد اُس نے کبھی پوسٹ کارڈ میں دین محمد اور سراج کا ذکر نہیں کیا۔ دادی جتنی گالیاں لکھواتی، وہ انہیں بڑھا چڑھا کر لکھتی۔ حتیٰ کہ دادی نے وہ زمین اونے پونے دین محمد کے پاس بیچ دی۔ وہ اکیلی کرتیں بھی کیا۔ سبھی کینیڈا کا ویزا لگوا کر نکل گئے تھے۔ ایک بھائی ماں کو، دوسرا بھائی باپ کو ساتھ لے گیا۔ بہن دوبئ میں جا بسی۔ جانے سے پہلے ماں نے اُس کی شادی کر دی۔ ابا کے توسط سے ایک آفس میں اچھی ملازمت بھی مل گئی۔ وہ سب مطمئن تھے۔ مگر اُس کی شادی صرف چند ماہ چل سکی۔ چار سال کی مقدمہ بازی کے بعد اُسے طلاق اور جہیز کا ٹوٹا پھوٹا سامان مل گیا۔ اب پچھلے کچھ برسوں سے وہ پھر دادی کے ساتھ تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی مجبوری اور ضرورت بن گئی تھیں۔

دفتر کے ڈائننگ روم میں لنچ کرتے ہوئے وہ حیران ہوتی رہی۔

کیا یہ وہی سرجو تھا؟... ''ناممکن۔''

''بالکل ممکن۔ یہ دیکھیے آپ کے سامنے بیٹھا ہوں... مگر آپ کی وجہ سے۔''

''ہاں! اُس دن جب آپ کو ماں کے رنگین پلنگ پر بیٹھے دیکھا تو اُسی وقت بہت کچھ سوچ لیا تھا۔''

''کیا سوچا تھا تم نے؟۔''

''یہی کہ''... وہ ہنسنے لگا۔

''تب میں نے ہاتھ سے چھڑی پھینک دی اور کتاب اُٹھالی۔ بڑی محنت کی... میں نے بھی اور بابا نے بھی۔ آپ کے پوسٹ کارڈ ابھی تک میرے پاس پڑے ہیں۔ لیکن ایک بات بتائیں، آپ نے بعد میں ہمارا ذکر پوسٹ کارڈوں میں کرنا کیوں چھوڑ دیا تھا۔ کیا خطا ہوگئی تھی۔ جب بھی دادی کا گالیوں سے بھرا پوسٹ کارڈ آتا، ہم دونوں اُس میں کچھ ڈھونڈتے رہ جاتے۔ میں تو ہر وقت ڈاکیے کے پیچھے ہوتا۔ ایسا کیوں کیا آپ نے؟''

''مجھے تو کچھ یاد نہیں رہا، اتنے سال تو ہو گئے۔''

''کبھی بھی کچھ میرے بارے میں نہیں سوچا۔''

''تمہارے بارے میں؟ کیا تھا تم میں کہ سوچتی۔'' وہ منہ کھول کر ہنسی۔

''ارے بابا کچھ یاد رہتا تو سوچتی۔ مگر تم نے ایسا سوچا بھی کیوں۔ کیوں ایسی توقع لگائے رکھی۔ کنونٹ میں سرخ ٹائیوں والے سمارٹ لڑکوں کے درمیان ایک بہتی ناک والے لڑکے کے بارے میں کیا سوچا جا سکتا تھا۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''اچھا کیا آپ نے''... اُس نے اداسی سے کہا۔

وہ نیم وا لبوں پر مسکراہٹ لیے اُسے گویا بہت اونچائی سے اور بے نیازی سے دیکھتی رہی۔

''اُس دن جب پہلی بار میں نے آپ کو دیکھا، ماں کے سرخ پلنگ پر تو میرا دل چاہا تھا، کنچے کی طرح آپ کو اپنی مٹھی میں دبا لوں۔''

''بڑے بدمعاش تھے تم۔''

وہ ہنس پڑا:

''ہم دیہاتی، ڈھور ڈنگروں کے پیچھے پھرنے والے، بڑی جلدی mature ہو جاتے ہیں۔ چلیے لنچ ٹائم ختم ہوا۔''

تو یہ وہ تھی اور یہ وہ تھا اور بیچ میں عمروں کی لمبی مسافت... جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

''کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دیہاتوں میں تو یہ عام سی بات ہے۔'' وہ سنجیدگی سے اڑا رہتا۔ وہ مذاق اُڑاتی اور مثالیں دیتی مگر وہ سنجیدہ رہتا۔

وہ اکثر اُس کی FX پر اُس کے ساتھ آنے جانے لگا...گلی کے موڑ تک۔ چند قدموں پر اُس کا فلیٹ تھا۔ کبھی کبھی وہ فلیٹ تک آ جاتی۔ فلیٹ بہت صاف ستھرا تھا، خاص طور پر بیڈ روم۔ سفید رنگ فلیٹ کی ہر چیز پر حاوی تھا۔ وہ اپنے لباس میں بھی سفید رنگ کو ترجیح دیتا۔

تو یوں ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ وہ جب بھی اُس کے ساتھ آتی، بیڈ پر بڑے بزرگوانہ انداز میں ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ جاتی۔ وہ اُسے آرام پہنچانے کے خیال میں گھلا جاتا۔

''کافی..... چائے؟''

''ہاں یار! اچھی سی کافی پلا دو، خوب پھینٹی ہوئی۔''

''ابھی لاتا ہوں''... وہ قدرے خفیف ہو جاتا۔

وہ بڑے انداز سے کافی پیتی اور وہ سامنے کرسی پر بیٹھا اُسے دیکھا کرتا۔ اُس کا چاندی جیسا سفید رنگ کمرے کی سفیدی میں رچ بس جاتا اور دور بیٹھے اُس کا سانس پھولنے لگتا۔ اُس کا دل چاہتا، اُس کے قریب جائے اور اُس کی سفید گلابی جلد کو چھو لے، خواہ اُنگلی کی ایک پور سے مگر وہ انجان سی بنی رہتی اور اُس کی آنکھوں کی سرد مہری اُسے ہمیشہ پیچھے کو دھکیل دیتی۔

''خبردار!''

اور وہ اندر ہی اندر اُبلتا رہتا اور بھوکی نظروں سے اُسے تکتا اور اُس کے قریب جانے کے بہانے ڈھونڈتا... بالکل دیوانہ سا ہو جاتا۔ مگر وہ تھوڑی سی ڈھیل کے بعد فوراً بزرگ بن جاتی۔

خاص کر دفتر میں وہ بالکل روکھی رہتی۔ دوسروں کے ساتھ گھل مل جاتی، قہقہے لگاتی،

چائے پیتی، لنچ پر چلی جاتی۔ اُسے معلوم تھا اِس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ اپنا اپنا لنچ منگوا کر کھایا جاتا لیکن وہ خوامخواہ کھولتا رہتا...

وہ بار بار اُس کا نام بھول جاتی۔

''ارے بھئی کیا نام ہے تمہارا؟...'' وہ ماتھے پر انگلی مارتی۔

''اوہ! ہاں بھئی سراج دین''...وہ ذرا بھی خفیف نہ ہوتا۔ اُسے کوئی کمپلیکس نہیں تھا۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا اُلجھتا رہتا۔ دفتر والے مذاق اُڑانے لگے تھے۔ چائے پیتے میں اکثر کہتے:

''ارے یار ایک کپ آنٹی جی کو بھی بھجوا دو نا۔''

وہ تلخ ہو جاتا۔ لڑ بیٹھتا تو وہ بُرا مان جاتی۔

''میرے معاملات میں دخل نہ دو تو بہتر ہے اور زیادہ جذباتی ہونے کی بھی ضرورت نہیں...پسرِ دین محمد۔''

یہ سن کر اُس کا چہرہ اُتر جاتا۔ وہ خوامخواہ اُسے اپنی ملکیت سمجھنے لگا تھا۔

چھٹی کے بعد وہ گاڑی سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ جاتے جاتے رکتی، جیسے اچانک نظر پڑ گئی ہو۔

''ارے سرجو! اِدھر کیا کھڑے ہو؟ آؤ ڈراپ کر دوں۔''

وہ روٹھا روٹھا سا آتا اور گاڑی میں بیٹھ جاتا۔ وہ ذرا بھی نوٹس نہ لیتی۔ اِدھر اُدھر کی بے مطلب باتیں کیے جاتی۔ فلیٹ کے پاس جب وہ گاڑی روکتی تو وہ تھوڑا رُک رُک کر اُترتا، پھر دروازے کے قریب کھڑا ہو جاتا اور دل کی گہرائی سے آواز دیتا۔

''آؤ...اترو نا''...وہ کچھ دیر خاموش رہ کر ہنس دیتی۔ پھر دروازہ کھول کر باہر آ جاتی۔

''دیکھو مجھے تمہاری یہ بیہودگیاں بالکل پسند نہیں، ایڈی پس کمپلیکس کے مریض'' وہ مذاق اُڑاتی۔

''کچھ بھی نہیں ہے مجھے اور میں یونہی کرتا رہوں گا...... جب تک تم...'' وہ ڈھٹائی سے کہتا۔

''کیا کہا؟'' مگر وہ اَن سنی کر دیتا۔

اُس وقت وہ اُسے ایک فل بوٹ پہننے والی پرانے زمانے کی سخت گیر استانی لگتی۔

جب وہ آگے پیچھے فلیٹ کے اندر آ جاتے تو وہ عموماً اُسے کافی بنانے کو کہتی۔

''چلو کافی بناؤ۔''

وہ دو انگلیوں سے پلنگ پر پڑی چیزوں کو اُٹھا کر اپنے لیے جگہ بناتی۔ وہ اس کی حرکتوں کو دیکھتا رہتا اور وہ بالکل ٹھنڈے انداز میں کالی کافی پیتی۔

''اچھا دین محمد کیسا ہے؟'' وہ جان بوجھ کر چچا کا لفظ حذف کر دیتی۔ وہ ذرا پرواہ نہ کرتا۔

''بابا ٹھیک ہے، ماں بھی ٹھیک ہے...اور کچھ۔''

''اور بھئی تمہاری بہن... وہی جس نے میرے منہ پر لگی لسی کو اپنے دوپٹے سے صاف کیا تھا۔''

''بوڑھی ہو گئی ہے۔''

''اچھا۔'' وہ ہنس دیتی۔

''اور تمہاری منگیتر... دیکھو انکار نہ کرنا... میں جانتی ہوں، گاؤں میں ایسے ہی طریقے ہیں۔ بتاؤ کیسی ہے وہ؟ بہت خوبصورت، نازک، نئی نویلی، اَن چھوئی... کیوں ہے نا...؟؟''

غصے سے وہ آگ بگولا ہو جاتا۔ وہ اُسے کس کس طرح کچل مسل رہی تھی... شاید جان بوجھ کر...

''میں تم سے شادی کروں گا... سنا تم نے... ورنہ مر جاؤں گا... اپنا گلا دبا لوں گا یہاں تمہارے سامنے۔ میں نے ماں سے بات کر لی ہے۔ وہ راضی ہے۔ بابا بھی خوش ہیں... آخر تم کسی سے تو شادی کرو گی... پھر وہ میں کیوں نہیں...'' ایک دن اُس نے صاف صاف کہہ دیا۔

''نہیں... ہرگز نہیں'' ...اُس نے کہنا چاہا... ''وہ تم نہیں ہو سکتے''...

مگر وہ خاموش، جانچنے والی نظروں سے اُسے دیکھتی رہی۔

خوش قسمتی بھی سمندر کی آتی جاتی لہروں کی طرح ہوتی ہے۔ اگر کوئی چاہے ان پر سوار ہو جائے ورنہ وہ گزر جاتی ہیں، کسی کا انتظار نہیں کرتیں۔ اُسے بھی کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ ادھر حالات کچھ درست نہیں تھے۔ کینیڈا جانے والے ان دونوں کو بھول گئے تھے۔ سوکھی تنخواہ میں سب خرچ چل رہے تھے۔ اوپر سے دادی کی آئے دن کی بیماریاں، پھر اتنے بڑے بل،

ملازم... تنخواہ تو مہینے میں بس ایک بار آتی تھی اور خرچ مہینہ بھر چلتا تھا... سب کچھ میلا اور پرانا ہو گیا تھا۔

''تم اپنی ماں جیسی سے شادی کرنا چاہتے ہو۔'' اُس نے بالآخر پھیکے لہجے میں کہا۔ وہ ہر طرف سے محفوظ ہونا چاہتی تھی۔

''بکو نہیں'' میرے اندر کوئی کمپلیکس نہیں، میں صرف تمہیں چاہتا ہوں۔ بہت پرانی چاہت ہے میری... سُنا تم نے... تمہارے لیے سب کچھ کروں گا۔ بابا نے وعدہ کیا ہے کہ اس فصل پر گاڑی لے دیں گے۔ خیبر چلے گی...'' وہ اُسے لالچ دے رہا تھا۔

''بس تم ہاں کر دو۔ دادی بھی ساتھ جائے گی، گاؤں سے کوئی نہیں آئے گا، سب کچھ منظور... ساری شرطیں قبول۔''

اُس دن، اُس نے فلیٹ کا جائزہ لیا... اچھی طرح سے... مختصر فرنیچر مگر نفیس اور خوبصورت... سارا سفید رنگ میں... چوائس اچھی تھی مگر وہ نظر انداز کر گئی... آئندہ کے تحفظ کے لیے یہ بہت ضروری تھا۔

''سیل میں لیا ہے سب۔''

''ارے نہیں بابا بالکل نیا ہے۔''

''اچھا! مجھے ایسے لگا جیسے سیکنڈ ہینڈ ہو، خاص کر یہ سنگل بیڈ۔''

''بالکل بھی نہیں۔ مجھے سیکنڈ ہینڈ چیزیں نہیں بھاتیں۔''

بالکل اچانک اُس کے منہ سے نکلا تھا۔ وہ تھوڑا چونکی اور اُس کی آنکھوں میں گہرائی تک دیکھتی رہی۔

ڈبل بیڈ کا ہونا ضروری تھا... ڈیکو پینٹ میں اس کے پاس ڈبل بیڈ اور بیڈ روم کا فرنیچر، میچنگ پردے اور قالین تو موجود تھا۔ اگرچہ دس سال پرانی چیزیں تھیں مگر ابھی تک ان میں بڑی گریس تھی۔ پالش تھوڑا ماند پڑ گیا تھا، پلنگ کے ایک پائے اور نچلے تختے کی بھی مرمت ہو چکی تھی، پھر بھی وہ گزارے لائق تھا۔ آخر فرق بھی کیا پڑتا ہے... جب من پسند خوبصورت عورت پاس ہو تو مرد کچھ اور نہیں دیکھتا، دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اور وہ تو بھالو کی طرح اُس کے تلوے چاٹ رہا تھا۔ اُس کے جنون پر اُسے پورا اعتماد تھا۔

''میں سوچوں گی۔'' بالآخر اُس نے کہا۔

اور خوشی سے اُس کا دل چاہا، وہ اُس کے نکھرے نکھرے وجود کو اپنے اندر سمیٹ لے۔ سگریٹ سلگاتے میں وہ اُس کے قریب ہو گیا... دونوں کے بیچ میں صرف ایک بھڑکا ہوا شعلہ تھا وہ تھوڑا سا جھکا۔ سنبل نے منہ کا سارا دھواں اس پر ڈال دیا۔ وہ کھانستا ہوا پیچھے ہٹا اور ہنسنے لگا۔ یوں ہاں اور نہ کے بیچ میں اٹکی وہ اسی طرح دفتر آتی جاتی رہی، اسی طرح دوسروں کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتی، باتیں کرتی، قہقہے لگاتی اور لنچ پر چلی جاتی۔ وہ اس کی اس نظر اندازی پر کھولتا رہتا۔

دفتر... FX... فلیٹ... اور کافی...

''میں سب کچھ بدل دینا چاہتا ہوں۔'' جب وہ فلیٹ پر ہوتی تو وہ اس پر حاوی ہو جاتا۔ وہ غصے میں ہوتا تو اُسے مضحکہ خیز سا لگتا۔

''میں سب کچھ بدل دینا چاہتا ہوں۔''

''کیا بدلنا چاہتے ہو؟''

''یہی کہ... یہی کہ۔'' ایک دن سراج نے اُس کے جوتے اُٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیے۔

''بس۔'' وہ خوب ہنسی۔

''نہیں... میں نے تمہارا نام بدل دیا ہے۔''

''اچھا!''

''ہاں... آج سے تم کرن ہو۔ مجھے صاف شفاف چیزیں پسند ہیں اور پرانی چیزوں سے نفرت ہے (اس کے ہونٹ بھی اس نام کو چھوتے رہے ہوں گے)۔ نکاح نامے میں بھی یہی لکھا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں تم بالکل ایک نئی عورت کی طرح میری زندگی میں آؤ۔ کوئی پرانا حوالہ، کوئی پرانا واسطہ تمہارے ساتھ نہ ہو۔ تمہیں اپنا یہ پرانا اسٹائل بھی بدلنا ہوگا (پہلے مرد کے لمس کا گھناؤنا تصور... اسے یقین تھا کہ ہر پرانی چیز میں اس کا لمس موجود ہے، حتیٰ کہ لپ اسٹک کے شیڈ میں بھی)... اور پہلی رات تم اپنی آنکھوں میں کپڑوں کے شیڈ کے لینز بھی لگاؤ گی۔''

''کیوں آخر؟''

''بس یونہی۔'' سراج نے اُسے کچھ نہیں بتایا۔

''تم دیوانوں جیسی باتیں کرتے ہو۔ نام اور چیزیں بدل دینے سے انسان نیا نہیں ہو جاتا۔''

''ہاں! مگر محسوس ضرور ہوتا ہے۔ میری خواہش یہی ہے۔ میں تمہیں بالکل ایک نئی عورت کی طرح دیکھنا چاہتا ہوں۔''

اس نے سراج کی بات پر زیادہ غور نہیں کیا۔ وہ سب کچھ جانتی تھی۔ یہ ساری باتیں صرف ایک رات سے پہلے کی ہوتی ہیں، پھر سب کچھ نارمل ہو جاتا ہے۔ جذبے کی شدت کو لگام پڑ جاتی ہے۔ اُس نے اندر ہی اندر سب کچھ طے کر لیا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ عورت کی ہوشیاری یہی ہے کہ وہ مرد کو زیادہ سوچنے کا موقع نہ دے۔ اور وہ جانتی تھی کہ وہ اندر سے کس قدر مضبوط اور بھرپور عورت تھی۔ اس میں کوئی بھی کمپلیکس نہیں تھا۔ یہ سب رسمی اور عارضی اہتمام ہوتے ہیں... بھوکے کو برتنوں سے غرض نہیں ہوتی۔''

اُس نے خوب چھانٹ پھٹک کی۔ پرانی قمیضوں میں اب بھی کچھ پیک پڑی تھیں۔ تھوڑا فیشن بدل گیا تھا لیکن کچھ اتنا زیادہ بھی نہیں، بس کالر تھوڑا چھوٹے ہو گئے تھے۔ اتفاق سے سائز ایک سا ہی تھا۔ امپورٹڈ قمیصیں تھیں، انہیں ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہیرے کی انگوٹھی اور گھڑی کا سٹریپ بھی قالین سے رگڑ کر چمکا لیا... گفٹ پیک تیار تھا۔

فرنیچر تھوڑا پرانا تھا اور جھاگ کی طرح نرم ملائم خوشنما رنگوں والا امریکن کمبل اگرچہ استعمال شدہ تھا، پھر بھی دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک ہی تھا۔ بکس کی بو دور کرنے کے لیے اس نے کمبل کو دھوپ میں ڈال دیا۔ کمبل پھیلاتے وقت اُس نے دیکھا کہ دو ایک جگہ پر مہین سے سوراخ ہیں۔ پچھلے کئی برس سے وہ ان چیزوں کو کسی تلخ یاد کی طرح بھول چکی تھی۔

نمازِ عصر کے بعد چند مشترکہ دوستوں کی موجودگی میں نکاح ہو گیا... سادگی اور خاموشی ہے۔ اس شام زمین پر گھٹنے ٹیک کر اُس نے اپنی بانہیں خمیدہ کمر دادی کے گرد حمائل کر دیں اور گود میں سر رکھ کر سرگوشی کی:

''بہت جلد تمہیں بھی لے جاؤں گی۔ دادی وہ مان گیا ہے اور یہ بھی بتا دوں وہ سراج

ہے، دین محمد کا بیٹا سرجو... یاد ہے نا...''

''ہاں جانتی ہوں۔'' دادی نے لمبی ٹھنڈی سانس کے ساتھ کہا۔

اُسی دن سراج اپنے گاؤں چلا گیا۔ اُسے اگلی رات کو واپس آنا تھا۔ فلیٹ کی ایک چابی اس کے پاس تھی۔

ڈیکو پینٹ کا بیڈ، میچنگ فرنیچر، پردے اور قالین... اس نے سبھی کچھ تبدیل کر دیا... اتنی بہت سی سفیدی اُسے کھٹک رہی تھی۔ اب کمرہ اماوس کی رات جیسا تھا۔ سب ٹھیک ہے اُس نے کمرے پر ایک نظر ڈالی۔

ابھی سراج کے آنے میں کافی وقت پڑا تھا۔ وہ کچھ آرام کرنا چاہتی تھی تاکہ اُس کے آنے تک بالکل فریش ہو جائے۔ اُس نے سائیڈ لیمپ جلایا اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔ پرانے پلنگ پر بیٹھے ہوئے اُس نے کچھ اداسی اور بے چینی محسوس کی اور جب پرانا کمبل اُس نے گھٹنوں پر ڈالا تو ایک عجیب گمبھیرتا سی اس پر طاری ہو گئی۔

سراج وقت سے بہت پہلے لوٹ آیا۔ وہ اُسے حیران کرنا چاہتا تھا۔ وہ خوش تھا اور اس کے لیے بہت سے پھول لایا تھا...

وہ یہ سارے پھول اس پر ڈال دے گا اور اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اس کے جسم کی ساری مہک اپنے اندر سمو لے گا...

اُس کے ذہن میں برسوں پہلے کی ایک تصویر تھی۔ وہ اُسے ماں کے سرخ پلنگ پر بیٹھے دیکھ رہا تھا۔ آج بھی وہ اُسے دروازے میں کھڑے ہو کر اُسی طرح دیکھے گا... گولڈن ریڈ نئے نکور پلنگ پر (ایسا کوئی پلنگ وہاں نہیں تھا)، کسی کرنوں سے بھرے چھوٹے سے خوبصورت کنچے کی طرح اور آج وہ اسے اپنی مٹھی میں بھینچ لے گا۔ اس خیال سے ہی اس کا جسم کانپنے لگا اور ماتھے پر ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔ وہ ایک ہانپتے ہوئے شخص کی طرح جذبات سے پُر اندر آیا تھا۔ اُسے یقین تھا وہ اُسے دیکھ کر پہلے کی طرح منہ کھول کر ہنسے گی مگر کچھ کہنے سے پہلے وہ اپنا ہاتھ نرمی اور محبت سے اُس کے منہ پر رکھ دے گا..... مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

وہ کمرے میں موجود تھی... کالے پلنگ پر۔ پرانا دو سوراخوں والا کمبل اُس کے گھٹنوں سے پاؤں تک لٹک رہا تھا۔ سائیڈ لیمپ کی ہلکی روشنی میں اُس کے تھکے ماندے چہرے پر کچھ

سائے اور لکیریں سی نظر آ رہی تھیں اور ان گمراہ کن سایوں میں اس کے اوپر کے تھوڑا او نچے دانت کچھ اور بڑے اور بھیانک دکھائی دے رہے تھے۔

اُس میں رنگ برنگے، خوبصورت، چمکیلے کنچے جیسی کوئی بات نہ تھی... وہ ٹھٹھک گیا... سارے پھول اُس کے ہاتھ سے گر گئے۔ تب اُسے لگا جیسے دو سوراخوں والا پرانا کمبل، اچانک پھیل کر پورے کمرے پر محیط ہوگیا ہے اور وہ ایک گھناؤنے احساس کے ساتھ، ان سوراخوں میں دھنستا، کہیں کسی اور طرف جا پڑا ہے۔

اپنا سامنہ

دونوں نے ایک خاص منصوبے کے تحت زندگی کا آغاز کیا تھا۔

جب وہ پہلی بار ملے تو دونوں نے فوراً ایک دوسرے کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا۔ نفسیہ کو ایک ایسے وجیہہ اور سمارٹ خاوند کی ضرورت تھی جو متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنی ظاہری وضع قطع سے اُونچے طبقے کا فرد دکھائی دے اور جمیل نے بھی سوچا تھا، نفسیہ اُس کے آئیڈیل پر پوری اُترتی ہے۔ اسے ایک ایسی ہی عورت کی ضرورت تھی۔ دونوں ایک آزاد، آرام دہ اور بے فکر زندگی کے متمنی تھے۔

شادی کے وقت نفسیہ سوشیالوجی میں ایم۔اے کرنے کے بعد نئی نئی ملازم ہوئی تھی اور جمیل کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ دیکھا جائے تو نفسیہ سے شادی کا اصل محرک یہی تھا، کیونکہ عورت کا ملازمت کرنا فیشن بن چکا ہے اور جمیل اس بات پر خوش تھا۔ صبح دونوں اکٹھے ناشتہ کر کے دفتر چلے جاتے۔ شام کا کھانا بھی اکٹھے کھاتے۔ گھومنے پھرنے کا پروگرام بھی اکٹھے بناتے۔ دعوتیں کھانے کھلانے کے بھی شوقین تھے۔ پہننے کو نت نیا لباس، رہنے کو ایک خوبصورت گھر اور سواری کے لیے سکوٹر...رفتہ رفتہ انہیں یہ ساری سہولتیں حاصل ہو گئی تھیں۔

نفیسہ کو گھر داری سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ گھر بیٹھنا اس کے لیے دوبھر تھا۔ چھٹی کا دن بھی عموماً وہ کسی پروگرام کے تحت باہر گزارتے۔

گھر کی دیکھ بھال انہوں نے خالہ معین کے سپرد کر دی تھی۔ خالہ معین بیوہ اور بے اولاد تھیں اور اپنی کم سخنی اور لیے دیے رہنے کی عادت کے سبب خاندان بھر میں مشہور تھیں۔ اس لحاظ سے انہوں نے ایک نہایت موزوں عورت کا انتخاب کیا تھا۔ خالہ معین نے اُن کے کسی

معاملے میں دخل انداز ہونے کی کبھی کوشش نہ کی تھی بلکہ اُن پانچ سالوں میں اُس نے اُن سے چند مخصوص جملوں کے علاوہ کوئی دوسری بات نہ کی تھی۔ نفیسہ خالہ سے بطورِ خاص خوش تھی۔

کبھی کبھار خالہ ناشتے کی میز پر پوچھ بیٹھتی:

''بیٹی آج کیا پکا لیا جائے؟'' تو نفیسہ کے کانوں کو یہ الفاظ اجنبی لگتے۔ وہ ایک ایسی بے تعلقی سے جس میں بناوٹ کی جھلک ہوتی، جواب دیتی:

''خالہ، بس یہ نہ پوچھا کرو۔ گھر داری میں مجھے صفر جانو۔'' اور جمیل اس کے جواب سے خوش ہو کر کہتا:

ہاں خالہ! ہم یہ سب کیا جانیں۔ ان معاملوں سے تم خود ہی نپٹ لیا کرو۔''

اور خالہ معین مزید کچھ کہے بغیر کواڑ کے پیچھے اپنا سفید سر لیے غائب ہو جاتی۔

مگر یہی نفیسہ دفتر کے کمرے میں اس بے تعلقی کا کبھی اظہار نہ کرتی۔ جب مسز وحید وزٹ پر آتیں اور وہ ہاتھ چلا کر تنبیہہ کہتیں:

''ٹارگٹ سے اتنا low شو کر رہی ہو! یاد رکھنا سالانہ ترقی پر اثر پڑے گا۔'' تو یہ الفاظ اُسے ہرگز غیر مانوس نہ لگتے۔ وہ کرسی میں دھنسی ان الفاظ کو بغور سنتی اور مسکرا کر کہتی:

''مسز وحید! واسطہ جاہل طبقے سے ہے۔ اتنی کنویسنگ پر بھی کیس نہیں ملتے۔ کیا کریں، عورتیں عجیب وغریب افواہیں اُڑا کر ہراس پھیلا دیتی ہیں۔ وہ جو ایک دو کیس بگڑ گئے تھے، اُن کا بڑا چرچا ہو رہا ہے...اور وہ....''

''بس بس! مسز جمیل کاغذی کارروائیوں میں یہ قصے کہانیاں نہیں لکھی جا سکتیں۔ اگر نوکری عزیز ہے تو ہمیں کیس شو کرنے ہوں گے...سمجھیں؟''

''سمجھ گئی۔ میں پوری کوشش کروں گی۔ پھر بھی کوئی کمی رہ گئی تو میرا کیس شو کر دیجیے گا۔ دیکھ لیجیے پانچ سال سے کیسی منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔''

''ہاں، شاباش!'' مسز وحید قدرے کھسیانے پن سے کہتیں کیونکہ اُن کے اپنے آٹھ بچے ہو چکے تھے۔ مسز وحید کو مزید مرعوب کرنے کے لیے وہ بھاگاں کو آواز دیتی:

''بھاگاں! کل عورتوں کو نو بجے اکٹھا کرنا ہے...سن لیا۔''

''جی باجی جان'' بھاگاں جواب دیتی۔

''ہاں اور یاد بھی رہے۔ نہیں تو ابھی کان کھینچ دوں؟''

''یاد رہے گا جی۔'' بھاگاں مسکرا کر جواب دیتی۔

اس دن گھر جا کر وہ جمیل سے یہ ضرور کہتی:

''آج رات سر پر بادام روغن کی مالش کروں گی اور صبح جلد اُٹھا دینا۔''

''کیوں؟'' جمیل انجان بن کر پوچھتا۔

''صبح جاہل عورتوں سے مغز پچی کرنا ہے۔''

''اوہو! اچھا.... تو پھر یہ سعادت مجھے نصیب ہو جائے۔'' اور رات کو وہ اپنے لمبے سیاہ بال کھول دیتی جنہیں جمیل بڑی محبت سے سہلاتا۔

صبح وہ جلد بیدار ہوتی اور بڑی مستعدی سے خاص بناؤ کیے دفتر پہنچ جاتی۔ نو بجنے سے ذرا پہلے جب بھاگاں اُسے عورتوں کے اکٹھا ہو جانے کی اطلاع دیتی تو وہ کہتی:

''بہت اچھا! بھاگاں، ذرا بھاگ کر ایک بینز لے آؤ۔ حلق تر کر لیں۔ نہیں تو بالکل پاپڑ ہو جائے گا۔''

بھاگاں بوتل لاتی اور وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے دیر تک اُس کی چسکیاں لیتی رہتی۔ بوتل ختم ہو جاتی تو وہ اپنا بیگ بھاگاں کو تھما کر اُس کے ہمراہ کسی گھر کے صحن یا کھلے کمرے میں جمع عورتوں کے درمیان جا پہنچتی۔

اُس کے لیے ایک عدد کرسی جھاڑ پونچھ کر اور گدی سے سجا کر وسط میں رکھ دی جاتی جس پر وہ بڑی تمکنت سے بیٹھ جاتی اور اپنے ہونٹوں کو ایک خاص انداز سے موڑ کر مسکراتی اور مختلف جسموں اور پسینے کی بُو سے بچنے کے لیے اپنا نرم و نازک، یوڈی کلون میں بھیگا ہوا، رومال ایک خاص ادا سے ناک پر رکھ لیتی۔ اس کے یہ انداز عورتوں کی نظروں میں کھب کر فوراً اُنہیں احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتے اور ایک موثر تقریر کے لیے راستہ ہموار ہو جاتا۔ عورتیں کچھ کہنے سے پہلے سوچنے لگتیں:

''اُن کی بھی کوئی زندگی ہے۔ نہ اوڑھنے کو نہ پہننے کو، نہ اچھا کھانے کو اور بچوں کا انبوہ خون چوسنے کو موجود۔'' پھر وہ دل میں اپنی بوڑھی ساسوں کو کوستیں:

''جنازے نکلیں اِن کم بخت بوڑھیوں کے، جو ابھی تک بیٹوں کے باغ میں نئے پھول

کھلتے دیکھنے کی ہوس اپنے کالے دلوں میں دبائے بیٹھی تھیں۔ مر کے پیچھا بھی نہیں چھوڑتیں۔ روگ کی طرح چمٹی بیٹھی ہیں۔ ارے انہیں نہیں مرنا تو ہم ہی اِس زندگی کے عذاب سے چھوٹ جائیں۔'' اور دلوں کا یہ غبار کسی وقت لاوے کی طرح زبان سے پھوٹ پڑتا۔ پھر ساس بہو میں تو تکار شروع ہو جاتی۔

''ہم جائیں گے باجی جان کے پاس۔''

''کیسے جائیں گے؟'' ساسیں ناک اُچکا کر بیٹوں سے ناک چوٹی کٹوا دینے کی دھمکیاں دینے لگتیں۔ وہ اشارے سے خاموش کرواتی۔

''کیوں مائی تیرا بیٹا کیا تنخواہ لیتا ہے؟''

''ڈیڑھ سو روپیہ۔''

''اور بچے۔''

''آٹھ۔''

''افوہ! اتنے بچے اتنے کم پیسوں میں کیسے پلتے ہوں گے۔'' اُس کا دماغ پگھلنے لگتا۔ ان جاہل لوگوں کو کب عقل آئے گی۔ کب یہ اپنی زندگیوں کو بہتر بنانے کی جدو جہد میں حصہ لیں گے۔ کب اُس کی محنت بار آور ہوگی۔

''کیوں مائی کیا کھا کر زندہ ہو، کچھ بہو کا بھی خیال ہے؟''

''اللہ پالن ہار ہے۔ جو جی آتا ہے اپنا رزق ساتھ لاتا ہے۔'' بڑھیا نہایت قناعت سے جواب دیتی، پھر بہو کی طرف منہ موڑ کر کہتی:

''کیوں ری، تو اس سگی کے پاس جا کر کیا دکھڑے روتی ہے۔ جس تھالی میں کھانا اُسی میں چھید کرنا۔ ہم نے چارہ کھلانے کو بھینس تو نہیں باندھی۔ بچے جنتے کیوں موت آتی ہے۔''

''میں کب گئی؟'' بہو گھبرا کر کہتی۔ اور وہ بہو کی مدد کو پہنچ جاتی۔

''مائی تجھے کندھا دینے جو گے تو ہو گئے ہیں۔ تم اپنے بیٹے کو سمجھاؤ۔''

''کیا سمجھاؤں؟'' بوڑھی ایسی خرانٹ آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھ کر طنز کرتی کہ باوجود اتنی دیدہ دلیر ہونے کے اُس کا ماتھا بھیگ جاتا۔ وہ ناک مسلنے کے بہانے اپنے حواس درست کرتی اور فوراً دوسری طرف متوجہ ہو جاتی۔

''چھ سال میں چار بچے بہت ہو گئے۔ اب غصہ تھوک دو... کیوں...؟''
عورت کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہتی:
''پھر میں کیا کروں، باجی جان۔''
''تم میرے پاس آنا۔''
اُس کے بعد وہ پچکے، بے رونق چہروں، مٹکی سے بڑھے ہوئے پیٹوں اور چندھی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے ایک مؤثر تقریر کرتی۔ نو بیاہتا یا ایک دو بچوں کی مائیں اُسے جھینپی جھینپی نظروں سے دیکھتیں اور ایک دوسری میں کہنیاں گھسا کر اور پلو منہ میں دبا کر ہنستیں۔ ادھیڑ عورتیں شکست خوردہ حسرت سے اُسے تاکتیں اور بوڑھی چندھی آنکھوں میں حقارت غصہ اور طنز بھر جاتی۔ اُس کے خاموش ہونے پر کوئی تمسخر سے پوچھ لیتی:
''کیوں بی بی! اِس نیک کام کا کیا معاوضہ لیتی ہو؟''
''کنواری ہو یا بیاہی؟'' دوسری سوال کرتی۔
''بیاہی ہوگی۔ کنواریوں کے منہ سے ایسی باتیں نکلتیں ہیں؟'' تیسری لقمہ دیتی:
''چودھویں صدی ہے۔ قیامت کی نشانیاں ہیں۔''
''دیکھ لو چہرے پر کیا پھٹکار برس رہی ہے۔''
''مرنا یاد نہیں رہا۔''
اُس کا دل جل جاتا۔ وہ تو ان کم بختوں کی بہتری کا سوچ رہی تھی اور وہ کیا سمجھ رہی تھیں۔ خدا غارت کرے ان کمبختوں کو۔ اُس کا دل چاہتا، سب کو ایک رسے سے باندھ کر اتنا پیٹے کہ ہوش ٹھکانے آ جائیں مگر اُسے ضبط سے کام لینا پڑتا کیونکہ اس دردسری کے عوض اُسے چند کیس ضرور مل جاتے تھے۔ کام چل رہا تھا۔
رات کو جب وہ جمیل کے مضبوط بازوؤں کے تنگ حلقے میں سمٹی ہوتی تو وہ ان جاہل عورتوں پر مزے لے لے کر پھبتیاں کستی اور قہقہے لگاتی۔ ان قہقہوں کی آواز کسی دوسری جگہ بیٹھی خالہ معین کو نہ جانے کیوں بے چین کر دیتی۔ اُس کا سفید سر ہلنے لگتا اور اُس کے زرد چہرے اور پھیکی سفید آنکھوں میں گویا آسیب گھروندے بنا لیتے۔
وہ ماں سے ملنے یا گھر جانے سے گھبراتی تھی۔ کیونکہ ماں جب ملتی، اُسے گہری گہری

عجیب نظروں سے دیکھتی۔ آخر ایک دن اُس نے چپکے سے کہہ دیا:

''پرانی کھوئی کے پاس ایک بہت پہنچے ہوئے بزرگ آ کر ٹھہرے ہیں۔ اگر کہو تو تمہیں کوئی تعویذ لا دوں؟''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی:

''ماں یہ سب کچھ ہمارے ہاتھ میں ہے۔''

''کیوں کفر بکتی ہو۔ قدرت کا کون مقابلہ کر سکتا ہے!''

''اب ان باتوں میں کچھ زیادہ حقیقت نہیں رہی ماں۔ اب سب کام اپنی منشا کے مطابق ہو سکتے ہیں۔''

''توبہ استغفار پڑھو بیٹی۔ یہی پٹی عورتوں کو پڑھاتی ہوگی۔''

وہ ہنس دی:

''ہمارا رزق ماں، اسی میں لکھا ہے۔''

''خاک ایسے رزق پر۔ شادی کے بعد دو چار بچے ہو جائیں تو مرد قابو میں رہتا ہے۔'' ماں نے ایک اور قیمتی نسخہ بتایا تھا۔

''یہ پرانے وقتوں کی باتیں ہیں ماں۔ اب تو مرد کو قابو میں رکھنے کا بس ایک طریقہ ہے کہ شادی کے بعد آٹھ سال تک بچے پیدا نہ کرو، ہاں!''

ماں اُس کی بات سے بگڑ گئی تھی۔ اس لیے صاف کہہ دیا تھا:

''بیٹی تو ہاتھ سے نکل گئی۔''

لیکن یہ تو اُس کا ذاتی تجربہ تھا۔ جمیل کس طرح اُس کی محبت میں بے بس ہو رہا تھا۔ اُس کی چاہت بے پایاں تھی۔ دنیا میں گویا اُس کے علاوہ اُسے کچھ اور سوجھتا ہی نہ تھا۔ دن رات وہ اُس کی ناز برداریوں میں لگا رہتا اور شاید اسی وجہ سے وہ قدرے مغرور ہو گئی تھی اور گاہے گاہے اُس کا روّیہ جمیل کی طرف بھی تحقیر آمیز ہو جاتا تھا۔ مگر جمیل ہمیشہ ٹال جاتا......

ہر رات سونے سے پہلے وہ اُس کے بیگ کی اشیاء کو جنہیں بے پروائی سے، وہ اِدھر اُدھر پھینک چھوڑتی تھی، اکٹھا کر کے بیگ میں رکھ دیتا۔ اگر کسی دن کوئی چیز رکھنا بھول جاتا تو نفیسہ دفتر سے آ کر اُلٹا دھونس جماتی... سارا دن پریشان رہی۔

''تمہیں خود اپنا بیگ چیک کر لینا چاہیئے۔'' جمیل مشورتاً کہتا اور نفیسہ یونہی منہ بگاڑتی رہتی۔

صبح جمیل بڑی محبت سے اُس کے گال تھپتھپا کر اُسے بے دار کرتا اور وہ آلکسی کیئے پلنگ پر اِدھر اُدھر ٹانگیں پھینکتی اور ٹوٹی ٹوٹی انگڑائیوں کے درمیان کہتی:

''ارے کیا صبح ہو بھی گئی؟''

''ہاں میری جان دس گھنٹے سو لیا۔ اب اُٹھ جاؤ ورنہ دفتر سے دیر ہو جائے گی۔'' یہ سنتے ہی وہ عموماً جھٹکا مار کر پلنگ سے اُتر جاتی۔ جمیل اُس کے سلیپر پاؤں سے کھسکا کر آگے کر دیتا ور وہ انہیں پہن کر گنگناتی ہوئی غسل خانے کی طرف چلی جاتی لیکن بعض اوقات نیند کے خمار میں وہ سُست پڑ جاتی اور اِک ادا سے کہتی:

''ہم آج دفتر نہیں جائیں گے۔''

جمیل کو بس اُس کی اِس ادا سے نفرت اور چڑ تھی۔ اُس کے چہرے کی شگفتگی فوراً رخصت ہو جاتی اور وہ سخت لہجے میں کہتا:

''ابھی چند روز پیشتر تم نے چھٹی کی تھی۔ آخر آج چھٹی کرنے کا کیا مقصد ہے؟ خواہ مخواہ ریکارڈ خراب ہو جائے گا۔''

''بلا سے ہو جائے۔ نوکری سے نکال دیں گے اور کیا کر لیں گے۔''

''اور یہ کیا معمولی بات ہو گی؟''

''بالکل'' وہ کاہلی سے کہتی۔

جمیل کا چہرہ بگڑ جاتا:

''یہ کاہلی نہ دکھایا کرو۔ اس طرح تو تم بہت جلد موٹی، بھدی اور بوڑھی ہو جاؤ گی۔ لو، اب اُٹھ جاؤ۔'' جمیل کے بدلے ہوئے لہجے کو محسوس کر کے وہ پوری آنکھیں کھول کر اُسے دیکھتی:

''کیا بات ہے؟''

''تم بہت پریشان کرنے لگی ہو۔'' جمیل تیوری چڑھا کر کہتا اور وہ اُسے غور سے دیکھتے ہوئے اُٹھ بیٹھتی۔ کوئی انجانا احساس اُس کے سینے میں چبھن سی پیدا کر دیتا مگر یہ چبھن عارضی

ہوتی۔ بہت جلد محبت کی گرم جوشی میں وہ اسے بھول جاتی۔

جمیل بہت کم اُسے رنجش کا موقع دیتا تھا، البتہ تنخواہ ملنے پر اُن کے درمیان معمولی سی جھڑپ ناگزیر تھی۔ اکثر تو نفیسہ روپے پیسے کی پرواہ نہ کرتی مگر کبھی کبھار جب وہ اپنی تنخواہ کا ایک حصہ اپنی کسی پرائیویٹ ضرورت پر خرچ کر چکی ہوتی تو جمیل کے حساب مانگنے پر جھنجھلا جاتی۔ جمیل پیسے پیسے کا حساب پوچھتا۔

''تمہیں اس کا حق نہیں پہنچتا۔'' وہ چڑ کر کہتی۔

''کیوں نہیں پہنچتا؟ میں تو ضرور پوچھوں گا اور تمہیں بتانا ہوگا۔'' وہ ہنسی مذاق کی آڑ میں کہے جاتا۔

''میں ایک لفظ نہ کہوں گی۔'' وہ بگڑتی۔

''ہمیں پیسے کی اَشد ضرورت ہے اور تم؟'' جمیل سمجھاتا۔ ایسے میں جمیل اُسے بڑا نیچ اور لالچی نظر آتا۔ پیسہ اُس کیلیے اہمیت رکھتا تھا۔ وہ پرس پھینک دیتی۔

''لے لو۔ جو کچھ ہے سب لے لو اور میری جان چھوڑ دو۔''

''تم تو میری جان ہو۔ تمہاری جان کیسے چھوڑ دوں۔'' جمیل ڈھیٹوں کی طرح ہنستا ہوا پرس اُٹھالیتا اور پیسے مختلف مدوں میں تقسیم کرنے لگتا۔ ساتھ ساتھ کہتا جاتا:

''دیکھ لو، اس بار تم نے بہت زیادتی کی ہے۔ پورا ایک سو کم ہے۔'' وہ دور پلنگ پر لیٹی اخبار کے صفحے اُلٹتی رہتی۔ کبھی زیادہ غصہ آ جاتا تو چلا کر کہتی:

''آئیندہ ایک پیسہ نہ دوں گی۔ اپنے ڈھائی سو میں سب پورا کرو۔''

جمیل کھسیانے پن سے مسکراتا:

''ہاں بھئی ہماری کمزوری تمہارے ہاتھ میں ہے۔ جتنا جی چاہے نیچا دکھاؤ، طنز کرو۔'' مگر ساتھ ساتھ حساب کیے جاتا۔

اس دن بھی تنخواہ ملی تھی اور وہ دونوں خوش وخرم ناشتے کی میز پر حساب کتاب میں مشغول تھے۔ اچانک جمیل نے مسکرا کر کہا:

''اس بار تو تمہیں ترقی بھی ملی ہے۔ پھر ہمیں کیا تحفہ دے رہی ہو... بازار میں ایک بہت اچھا پل اوور آیا ہے۔ قیمت سو سے کم نہ ہوگی۔ پھر دے رہی ہو نا خرید کر۔''

یہ کوئی نئی بات نہ تھی مگر اُس وقت نفیسہ اس بات سے بدمزہ ہوگئی:

''اوپر سے شاندار نظر آنے کے باوجود تم بہت نیچ آدمی ہو۔'' اُس نے نفرت سے کہا اور جمیل ہنس دیا تھا پھر مسمسی صورت بنا کر بولا:

''ناراض کیوں ہوتی ہو۔ تمہاری مرضی نہیں تو نہ سہی... اور سنو! نارمن وزڈم کی ایک بہت مزاحیہ پکچر ریلیز ہوئی ہے۔ پروگرام بناؤ تو ایڈوانس بکنگ کروالوں۔''

مگر وہ اس وقت سخت بے زار اور چڑ چڑی ہو رہی تھی۔ جمیل کو جواب دینے کے بجائے وہ کمرے میں داخل ہوتی ہوئی خالہ معین کی طرف متوجہ ہوگئی اور جب اُس نے سرسری طور پر گھر کا حساب کتاب پوچھا تو دونوں کی آنکھوں سے اس انوکھی بات پر حیرت اُمنڈ پڑی۔ خالہ معین کا آبنیبی چہرہ تو فوراً تاثر سے خالی ہو گیا مگر جمیل بھڑک اُٹھا:

''حساب میرے پاس ہے اور نفیسہ! خالہ ہماری ملازمہ نہیں ہے۔ یہ اس کا احسان ہے ہم پر... اور تمہیں...''

''لیکن؟''

''بس! نفیسہ یہ باتیں تمہیں نہیں پھبتیں۔ تم انہیں خالہ معین پر چھوڑ دو۔''

''کیوں؟''

''تم گھر اور دفتر کا کام اکیلی کیسے نپٹا سکتی ہو۔''

''میں نوکری چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔ اس سے میری ذات کو فائدہ بھی کیا ہے؟'' یہ بات بلا ارادہ اُس کے منہ سے نکل گئی تھی۔ مگر جمیل سناٹے میں آ گیا۔

''پھر کیا کرو گی؟''

''گھر کا کام!''۔ اُس نے محض چڑانے کی خاطر کہا تھا کیونکہ اس کی ڈگر پر چلنے والی عورت ایسی مضحکہ خیز بات سوچ ہی نہیں سکتی اور یوں کہتے ہوئے وہ اپنے اس تصور پر مسکرا دی تھی...

وہ میلے کپڑے پہنے گھر کو جھاڑ پونچھ رہی ہے۔ تخت پر لیٹی بچے کو دودھ پلا رہی ہے۔ دروازے میں کھڑی سبزی والے سے مول تول کر رہی ہے۔ دیوار سے سر نکالے پڑوسن سے گپ لڑا رہی ہے... اُس نے گھبرا کر سر کو جھٹکا تو ایک دوسری تصویر اُس کے سامنے آ گئی۔

وہ کہنیوں تک سونے کی پھنسی پھنسی چوڑیاں پہنے نوکروں پر حکم چلا رہی ہے اور اس کے بہت سارے بچے اندر کمروں میں اُودھم مچائے ہوئے ہیں۔ اُس نے ان سب کو گننے کی کوشش کی مگر دس تک پہنچ کر وہ گڑ بڑا گئی اور اُسے اپنے تصور سے ایسی گھن آئی کہ وہ اپنا پچھلا غصہ بھول گئی مگر جمیل اُس کی مسکراہٹ کو غلط سمجھ کر بولا:

''گھر کے کام کے لیے تو میں نوکرانی بھی رکھ سکتا تھا۔ تم سے بیاہ کرنا کیا ضروری تھا۔''

جمیل کا چہرہ غصے سے بگڑ کر ایک اجنبی شخص کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اُس کے ذہن میں چھنا کا سا ہوا۔ وہ نئے سرے سے برافروختہ ہو کر بولی:

''پھر تو تم ایک جھوٹے اور خود غرض شخص ہو۔''

''تم جو بھی سمجھ لو مگر فی الحال تم نوکری نہیں چھوڑو گی۔''

''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔''

''بے وقوف، شادی کے بعد عورت کا کوئی معاملہ بھی ذاتی نہیں رہتا۔''

''یہ تم کہتے ہو؟''

''ہاں۔''

وہ سنجیدہ نہیں تھی۔ اگر جمیل غصہ دکھانے میں جلد بازی نہ کرتا تو بات مذاق میں ٹل جاتی۔ مگر اب سوال اَنا کی حفاظت کا تھا اور وہ اپنے موقف پر ڈٹ گئی تھی اور اُسے حیرت انگیز طور پر محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سوچ اتنی مضحکہ خیز نہ تھی بلکہ ایک ٹھوس حقیقت تھی اور اب تو اس کی زندگی اور زندگی کے اطمینان اور خوشی کا دارومدار ہی اس سوچ پر تھا۔

اُس دن وہ دفتر نہیں گئی۔ جمیل غصے میں ناشتہ کیے بغیر اکیلا دفتر گیا اور دن بھر غائب رہا۔ رات گئے جب وہ لوٹا تو وہ بستر پر بت بنی خاموش پڑی تھی۔ کوئی بات کیے بغیر وہ اپنے بستر میں چلا گیا۔

وہ ناراض تھا مگر اس کا حق اُسے نہیں پہنچتا تھا۔ یہ سوچ اُس کے ذہن کو جھنجھوڑ رہی تھی۔

صبح جب وہ بیدار ہوئی تو جمیل اُس پر جھکا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں محبت اور چہرے پر وہی شگفتگی اور نرمی تھی۔ یقیناً وہ ایک اچھا اداکار تھا۔ وہ منہ پھیر کر اُٹھ بیٹھی۔

اُس دن کے بعد دونوں کے درمیان ایک کھنچاؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔ دونوں گویا کسی

درمیانی تعلق کے بغیر دو مختلف کناروں سے ایک سمت میں بڑھ رہے تھے۔
اب وہ اَز خود کسی کَل کی مانند بستر سے اُٹھ بیٹھتی۔ ناشتے کی میز پر بھی دونوں خاموش رہتے۔ جمیل اخبار پڑھتا رہتا اور وہ کھانستے، کھنکارتے چائے میں مصروف رہتی۔ خالہ معین سے اُسے جانے کیا چڑ ہوگئی تھی۔ جب وہ پردے کے پیچھے سے اپنا سفید سر نکال کر اندر جھانکتی، وہ بھنا جاتی اور بلاوجہ برتنوں کو میز پر پٹخنے لگتی۔ سفید سر پردے کے پیچھے چھپ جاتا مگر کہیں قریب ہی اس کی موجودگی کا احساس اُس کے لیے اتنا شدید، گہرا اور ناقابلِ برداشت ہوتا کہ وہ ناشتہ اَدھورا چھوڑ کر اُٹھ جاتی۔ اس کے اُٹھتے ہی جمیل بھی اخبار پھینک کر اُٹھ جاتا۔ وہ خواہ کتنی تیزی دکھاتی مگر جمیل بھی بروقت تیار ہو جاتا۔

''تم میرے لیے یہ زحمت نہ کیا کرو۔ میں ٹیکسی سے چلی جایا کروں گی۔'' ایک دن اُس نے بڑی رُکھائی سے کہا۔

''ٹیکسی میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' جمیل نے سختی سے جواب دیا تھا۔

''ہاں! یہ تو بڑی فضول خرچی ہوگی۔'' اُس نے جل بھن کر کہا تھا اور بیگ اُٹھا کر گیٹ کی طرف لپکی تھی اور جمیل کے سکوٹر نکالتے نکالتے وہ سڑک کا موڑ کاٹ گئی تھی۔ جب جمیل نے سکوٹر اُس کے قریب لے جا کر روکی تو وہ شرارت سے مسکرا رہا تھا۔ وہ پہلے کی طرح ہنسنا، بولنا اور مذاق کرنا چاہتا تھا مگر نفیسہ اتنی خاموش اور گمبھیر تھی کہ وہ بات کرنے کا حوصلہ نہ پا سکا۔ نفیسہ کو آفس کے قریب اُتار کر جب اُس نے سکوٹر موڑا تو اُس نے دل میں ارادہ کرلیا تھا کہ وہ آج اس سرد جنگ کو ختم کردے گا۔ رات کو اُس نے اُسے گھیر لیا:

''ناراض ہو؟''

''میں کیوں ہوتی۔''

''چلو معاف کردو۔''

''کس بات پر؟''

''کسی بھی بات پر۔''

''میں ضرورت یا ذریعہ نہیں ہوں۔''

''کون کہتا ہے؟''

''تم سمجھتے ہو۔ میری اپنی ایک حیثیت ہے۔''

''ضرور ہے اور میں تمھیں تمہارے لیے چاہتا ہوں۔''

''اچھا!'' نفیسہ بڑے استہزا سے ہنسی۔

''تم ایک جھوٹے اور خود غرض آدمی ہو۔ جب میں تمہارے بازوؤں کی گرمی کو محبت کی گرمی سمجھ رہی تھی تو دراصل میں خود غرضی کی آگ میں بھسم ہو رہی تھی۔ ہمارا یہ تعلق کِس قدر کمزور اور کچا ہے۔ میں غلط سوچتی رہی ہوں۔ آؤ، اس تعلق کو ختم کر دیں۔'' نفیسہ سسک پڑی۔

جمیل نے اُسے نرمی سے تھپکا: ''تم بے وقوف ہو!''

''مجھے اب احساس ہوا ہے، میری زندگی کِس قدر کھوکھلی اور غیر یقینی ہے... اور میرا مستقبل نامعلوم! ہمارا تعلق ختم ہو جانے والا...... مگر یہ تصور کتنا جاں سوز ہے۔ کیا ہم نیا تعلق نہیں پیدا کر سکتے؟'' اُس نے معنی خیز نظروں سے جمیل کی طرف دیکھا تھا۔

''مگر تمہاری ملازمت کا کیا بنے گا؟''

نفیسہ کے دل پر جیسے کسی نے گھونسہ مار دیا۔ اپنے برافروختہ جذبات پر قابو پانے کے لیے اُسے چند لمحے خاموش رہنا پڑا۔ غصے سے اُس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے مگر وہ کمال ضبط سے مسکرائی۔

''خالہ معین جو ہیں...... پھر ہمیں کِس بات کا فکر ہے۔''

''ہاں! مگر سوچ لو نوکری نہیں چھوڑنے دوں گا۔ ابھی ہمیں اپنے مستقبل کو تعمیر کرنا ہے۔''

''کاش تم کچھ زیادہ پڑھے لکھے ہوتے۔'' نفیسہ نے جل کر کہا۔

جمیل کھسیانے پن سے ہنس پڑا:

''مگر پھر شاید تم اس جگہ نہ ہوتیں۔ میں ضرور کسی اُونچے طبقے کی لڑکی سے شادی کرتا۔''

''اچھا!'' نفیسہ کا دم گھٹ سا گیا۔

وہ وہاں کیوں تھی؟ کیوں تھی....؟

اُس کی خاموشی کو بھانپ کر جمیل نے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا اور مسکرا کر بولا:

''بس اتنا سا دل ہے تمہارا! واہ میں تو مذاق کر رہا تھا۔'' اپنی بڑائی جتانے کا یہ اچھا

حربہ تھا۔ مگر جمیل نے اُس کی خواہش کو رد نہیں کیا تھا۔ اس لیے وہ دل میں کڑھنے اور جمیل کے خلاف نفرت محسوس کرنے کے باوجود خوش تھی۔ اب وہ دن رات نئے منصوبے بنایا کرتی، چپکے چپکے، جن کی خبر جمیل کو ہرگز نہ تھی۔

وہ اپنے بچے کو خالہ کی ٹھنڈی آغوش میں ہرگز نہیں پلنے دے گی۔ وہ اُسے خود پالے گی۔ اپنی گود میں کھلائے گی، اپنے سینے سے چمٹائے گی اور خود لوریاں دے گی۔ وہ اس کے لیے جیے گی، اور جب وہ جمیل کو اس نئے بندھن میں جکڑے گی تو پھر وہ اسے اپنے دل سے یوں دور محسوس نہ کرے گی۔ اور اگر جمیل تب بھی یونہی خودغرضی دکھائے گا تو اُسے کیا پرواہ ہو گی! ہاں مگر اُس سے پہلے اُسے خالہ معین کو اس گھر سے نکالنا ہوگا۔ نہیں تو وہ گھر کی طرح اُسے بھی سنبھال لے گی اور یہ گھر اُس کا کبھی نہ ہو سکے گا اور نہ کبھی وہ زمین کے اُس ٹکڑے پر نڈر ہو کر اور قدم جما کر کھڑی ہو سکے گی۔

دن آہستہ آہستہ گزر رہے تھے مگر وقت کی یہ رفتار کس قدر صبر آزما تھی۔ وہ کسی انوکھی بات کی منتظر تھی۔ پھر یہی سست رفتار وقت ہوا ہو کر ایک سال میں ڈھل گیا اور وہ حیران رہ گئی۔

کسی انجانے خوف نے اُس کے دل پر پنجے گاڑ دیے اور وہ پریشان اور خوف زدہ سی نظر آنے لگی۔ وہ تنہائی میں اپنے بانس جیسے لمبے اور سوکھے جسم کو ٹٹولتی جس پر نشیب و فراز بے معلوم سے تھے بلکہ کافی حد تک سپاٹ! اس جسم کی جمیل نے کئی بار تعریف کی تھی مگر جمیل کے سچ اور جھوٹ میں امتیاز مشکل تھا۔

وہ چور اور دزدیدہ نظروں سے آئینے میں دیکھا کرتی۔ اس کا چہرہ پھیکا، بے رونق اور زرد تھا۔ اتنی فراغت اور بے فکری کے باوجود وہ شباب کی چمک دمک سے محروم، سوکھی اور مرجھائی ہوئی تھی۔ آج تک اُس نے اپنے آپ پر غور نہیں کیا تھا۔ اُس کی زندگی اتنی مصروف اور خوش گزری تھی مگر اب وہ بڑی فکرمندی سے اپنا جائزہ لیا کرتی۔ جمیل اُس کے مقابلے میں حسن و شباب کا مجسمہ تھا اور اُسے اپنے مقابل دیکھ کر اُس کا دل اور بھی گھٹ جاتا۔ وہ پہلے تو ایسی نہ تھی، وہ سوچا کرتی۔

پھر اُس کی نظریں بلاوجہ خالہ معین پر پڑنے لگتیں اور خالہ کے خلاف اُس کے دل میں دبی ہوئی نفرت شدت اختیار کر گئی تھی۔ اُس کا بس نہیں چلتا تھا کہ خالہ کو کھڑے کھڑے گھر

سے نکال دیتی۔ کسی منحوس سایے کی طرح وہ اس سے چمٹ گئی تھی۔ یہ وہم اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا کہ جب تک خالہ معین اس گھر میں موجود ہے، اُسے خوشی اور اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا۔ کبھی کبھار وہ اپنی ان سوچوں پر غور کرتی تو اُسے تاسف سا ہوتا۔

آخر خالہ معین کا قصور بھی کیا تھا؟ وہ ان کے گھر کو اپنا گھر سمجھ کر اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ کبھی اُس نے کسی بات پر ماتھے پر تیوری نہ ڈالی تھی، نہ کبھی شکایت کا کوئی لفظ منہ سے نکالا تھا۔ پھر وہ اُس کے خلاف دل میں نفرت کیوں پال رہی تھی؟ مگر وہ اس سے شدید نفرت کرتی تھی۔ اور اس نفرت کو دل سے نہیں نکال سکتی تھی۔ راتوں کو کئی بار وہ ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھتی۔ اُسے خالہ معین کا سفید سر اپنے اُوپر جھکا دکھائی دیتا اور وہ اس کے سوکھے استخوانی ہاتھوں کو اپنے جسم پر پھرتا محسوس کرتی۔ وہ گھبرا کر بیڈ کا سوئچ آن کر دیتی۔ خالہ کا سایہ فضا میں لہرا کر غائب ہو جاتا۔ جمیل کی آنکھ کھل جاتی۔

''کیا بات ہے جان؟''

''کچھ نہیں'' وہ پھٹی پھٹی نظروں سے کمرے میں چاروں طرف دیکھتی۔

''کوئی بُرا خواب دیکھا ہے؟''

''ہاں۔''

''چلو سو جاؤ۔ صبح دیر سے اُٹھو گی تو دفتر وقت پر نہ پہنچ سکو گی۔''

وہ ٹھنڈا سانس لے کر بتی بجھا دیتی۔

پھر کسی وقت اُس کا پیٹ بوجھل ہو جاتا۔ اُسے یوں لگتا جیسے اُس کے پیٹ کے اندر لوہے کا گولا چکر کاٹ رہا ہے۔ وہ گھبرا کر اپنا پیٹ ٹٹولنے لگتی۔

دفتر سے بھی اُس کی طبیعت اُچاٹ ہو گئی تھی بلکہ یہ کام اس کے ضمیر پر ایک بوجھ بن گیا تھا۔ وہ عجیب عجیب باتیں سوچتی۔ کبھی اُسے محسوس ہوتا جیسے وہ عورت نہیں رہی اور ایسی پکی باتیں منہ سے نکال نکال کر اُس کی صورت اُجڑ گئی ہے۔

وہ رُوکھے پھیکے بیزار چہروں والی عورتوں کے درمیان بیٹھتی تو خود کو مجرم سا محسوس کرتی۔ رٹے رٹائے مؤثر جملے اُسے بھول جاتے اور وہ اصل مسئلے کے بجائے مختلف قسم کے سالن پکانے اور بچوں کی شرارتوں پر بات چیت شروع کر دیتی۔ کوئی حاجت مند عورت اُس

کے پاس آتی تو وہ ٹال مٹول کر جاتی یا ضروری اشیاء نہ ہونے کا بہانہ کر دیتی اور اُس دن جب انہیں کے سنٹر میں کیس بگڑ گیا تو وہ سخت پریشان ہوئی تھی۔ کئی دن اُس پر مردنی سی طاری رہی۔ بار بار اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس عورت کا خون سے خالی سفید چہرہ گھوم جاتا تھا۔ اُس نے جمیل سے بھی ذکر کیا تھا:

''میرا جی چاہتا ہے کوئی اور نوکری ڈھونڈ لوں۔''

''تم تو بیوقوف ہو۔ نوکریاں کہاں ملتی ہیں؟ پھر ایسی باتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔ تم کیوں اپنا دل چھوٹا کرنے لگتی ہو؟''

وہ خاموش ہو رہی۔ اِن دنوں وہ جمیل سے خاصی دبنے لگی تھی۔ کئی بار اُسے محسوس ہوتا جیسے جمیل کی آنکھوں میں طنز اُبھر رہا ہے۔ کبھی وہ پوچھ بیٹھتا:

''نفیسہ، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' تو وہ گھبرا جاتی اور نظریں چراتی۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ تم کیوں پوچھتے ہو؟''

''ویسے ہی۔'' جمیل گہری نظروں سے اُسے دیکھ کر مسکرا دیتا اور وہ بوکھلا جاتی۔

وہ اُسے کیا جتانا چاہتا تھا؟ وہ دیر تک ذہنی اضطراب میں مبتلا رہتی۔

اس دن مسز وحید اچانک آنکلیں۔ یقیناً کسی نے اُس کے خلاف کان بھرے تھے۔ وہ خاصی جھنجھلائی ہوئی تھی۔

''کونسلنگ کے باوجود کیس کیوں نہیں ملتے؟''

''بیک ورڈ علاقہ ہے۔''

''یہیں تو زیادہ کوشش کی ضرورت ہے۔''

''کرتے تو ہیں۔''

''میں نے اِس کے برعکس سنا ہے۔'' وہ خاموش رہی۔ مسز وحید نے فائل کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔

''ہمیں کیس چاہئیں، کیس... ہر حالت میں۔''

''میں کیا کر سکتی ہوں؟''

''سنو!'' مسز وحید اچانک کچھ سوچ کر بولیں۔

''ہم پرفارمنس اتنا لو شو نہیں کر سکتے۔ تمہیں غلط اندراج کرنا پڑے گا۔''

''میں غلط نہ لکھوں گی۔''

''جن لڑکیوں سے ٹارگٹ پورا نہیں ہوتا وہ یہی کام کرتی ہیں۔ بس ذرا ہوشیاری کی ضرورت ہے۔''

''مگر مجھ سے یہ نہ ہوگا۔''

''تو اس کا نتیجہ تم خود بھگتو گی۔''

''بھگت لیں گے۔'' اُس نے تیزی سے جواب دیا تھا۔ مسز وحید کی بات سے وہ سخت بھنا گئی تھی۔ اس دن ویسے بھی اسے ہسپتال اپنی سہیلی ڈاکٹر مسز سہیل سے ملنے جانا تھا۔

مسز وحید کے روانہ ہوتے ہی اُس نے آفس بند کر دیا۔ ہسپتال میں اس کی سہیلی نے بڑے غور سے اُس کی بپتا کو سنا اور اس کے بچگانہ خوف پر قہقہہ لگایا:

''یہ تو بہت کم مدت ہے۔ ابھی سے فکر مند ہونے کی کیا بات ہے۔ ویسے تم دو چار دن میرے پاس آؤ، میں سب دیکھ لوں گی۔'' اُس نے بڑے اعتماد سے اُس کے شانے کو تھپتھپایا تھا۔

''بالکل فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اچھا!''

وہ حیرت اور خوشی کے جذبات لیے گھر پہنچی۔ مسز وحید سے جھڑپ لینے کے بعد اُس کا موڈ خراب ہو گیا تھا مگر اب وہ بالکل ہشاش بشاش تھی۔ اور اس کی بشاشت کو جمیل نے بھی محسوس کیا تھا۔

''کیا بات ہے؟ آج بہت خوش ہو!''

''ہاں!''

''کیوں کیا ڈبل ترقی ملی ہے؟''

وہ ہنس پڑی: ''بس تمہیں ایسے ہی خواب آتے ہیں۔''

''پھر؟''

''کوئی ہوگی بات۔''

''کیا بات؟''

''سب باتیں نہیں بتائی جاتیں۔''

اُس نے گہرے لہجے میں کہا جو شک میں ڈالنے والا تھا اور جمیل سچ مچ شک میں پڑ گیا۔ اُس نے گہری تیکھی نظروں سے اُسے دیکھا اور مسکرا کر بولا: ''ہوں!''

وہ جمیل کو شک میں ڈال کر اور بھی خوش ہوئی۔ اُس کا دل چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اُس کے سینے میں وہ راز آ جائے جسے بتا کر اُس کا سرتن جائے، اور جو جمیل کی طنز بھری نظروں کا بھرپور جواب ہو... مگر ابھی اُسے کچھ اور انتظار کرنا تھا۔

چند دن وہ بہت خوش وخرم دکھائی دیتی رہی، پھر آہستہ آہستہ اُس کی خوشی شک میں بدلنے لگی اور ایک دن جب وہ ہسپتال سے نکلی تو اُس کے چہرے پر مایوسی کی پرچھائیاں کانپ رہی تھیں۔ وہ کھوئی کھوئی اور سخت پریشان تھی۔ اُسے اپنی سہیلی کی کہی ہوئی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''یہ ناممکن ہے؟''

''میرا خیال ہے یہ سب کچھ بعد میں ہوا۔ آخر تمہیں شروع میں ایسی احتیاط پسندی کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟ تمہاری آمدنی بھی معقول ہے۔''

اُس کی زبان گنگ ہوگئی۔ وہ کیا کہتی؟ یہ سب جمیل کے لالچ کا نتیجہ تھا۔ وہ برباد ہوگئی تھی، مگر اُسے کیا فرق پڑا تھا۔ وہ اب بھی ویسا تھا۔ مگر وہ خود بھی بے قصور نہ تھی۔ وہ خود اس کی قائل تھی اور کیسے بھیانک طریقوں سے کنویسنگ کرتی تھی۔

جب وہ مردہ قدموں سے سڑک پر آئی تو اُسے محسوس ہوا جیسے بہت سے ننھے منے نرم و نازک ہاتھ اُس کے پیچھے تالیاں پیٹ کر اُس کا تمسخر اُڑا رہے ہیں۔ اُس نے گھبرا کر ایک رکشا کو اشارہ کیا اور اُس میں سوار ہوگئی۔

گھر پہنچ کر اُسے سکون سا محسوس ہوا۔ جمیل گھر پر نہیں تھا۔ وہ تنہائی میں اس مسئلے پر غور کر سکتی تھی... مگر اب غور کرنے کو کیا بچا تھا؟

اس دن جمیل رات گئے لوٹا۔ وہ جلد بستر پر چلی گئی۔ وہ جمیل کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ صبح ناشتے کی میز پر دونوں کا سامنا ہوا تو اُسے دیکھ کر وہ قدرے حیران رہ گیا:

''کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں ٹھیک ہے'' اس نے اکھڑے لہجے میں کہا اور جمیل چونک کر بولا:

''کہیں مسز وحید سے جھڑپ تو نہیں ہو گئی؟''

''ہاں ہوئی تھی'' اُس نے ٹالنے کو کہا۔

''کس بات پر؟''

''پرفارمے غلط بھرنے کو کہہ رہی تھی'' وہ بے خیالی میں بولے جا رہی تھی۔

''تو بھر دیتیں!''

''کیوں؟''

''رپورٹ ہو جائے گی۔''

''ہو جائے۔''

''نوکری؟''

''ایسی نوکری کو آگ لگے'' نفیسہ بھڑک اُٹھی:

''میں خود استعفیٰ دے دوں گی۔''

''یہ ضد بھی خوب ہے۔'' جمیل نے تلخی سے کہا اور نفیسہ کا گلا رندھ گیا۔

اُس کے دکھ کو کون سمجھے گا، کون اُسے دلاسا دے گا؟ وہ اپنا دکھ بانٹنا چاہتی تھی مگر کس سے؟ وہ جمیل سے یہ کیونکر کہہ سکتی تھی کہ وہ اب عورت نہیں رہی۔ جمیل یقیناً اُس کا تمسخر اُڑاتا...

''تم پہلے بھی عورت نہ تھیں۔ اب خوامخواہ دوسروں کو الزام نہ دو۔ اپنی صورت دیکھو۔''

اور وہ جمیل کے اس بہتان کو غلط ثابت نہ کر سکتی تھی۔ اور یہ خالہ معین؟ وہ بالکل بے بس تھی اور خود شک میں مبتلا ہو گئی تھی۔

''مجھے آج جلد پہنچنا ہے۔'' اُس نے بھرے گلے سے کہا تھا اور ناشتہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

•

وہ لمبی اور سیدھی سڑک پر بے تکان بڑھے جا رہی تھی۔ وہ کہاں جا رہی تھی، اُسے کچھ علم نہ تھا۔ اُس کا ذہن مفلوج اور حواس غائب تھے۔ وہ ایک غلط راستے پر آگے بڑھ رہی تھی اور

یوں تیزی سے بڑھ رہی تھی جیسے کوئی بلا اُس کے تعاقب میں ہو۔ اس دن فضا میں حبس اور گھٹن تھی اور سانس لینا دشوار تھا۔ وہ چلتی گئی حتیٰ کہ اُس کے پاؤں شل ہو گئے اور اُسے اپنے آپ پر رحم آنے لگا۔ وہ ایک بس سٹاپ پر رُک گئی۔ اُس کا حلق پیاس کی شدت سے خشک ہو رہا تھا اور جسم پسینے سے تر تھا۔ اپنی مظلومیت اور بے بسی کو محسوس کر کے اُس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ آنسوؤں کے بے شمار قطرے لڑھک کر اُس کے برقع کے نقاب میں جذب ہو گئے۔

اُسے اچانک اپنا گھر یاد آیا... آرام دہ اور پُرسکون گھر! پھر اُسے جمیل کا خیال آیا جو کرسی میں دھنسا اطمینان سے اخبار دیکھ رہا ہوگا۔ وہ اس کے متعلق سوچے گا بھی نہیں۔ کاش وہ اس کے دل کے قریب ہوتا۔ تب اُس نے محسوس کیا، کوئی شے مقناطیس کی طرح پیچھے کی طرف کھینچ رہی ہے... مگر وہ ایک غلط راستے پر بہت آگے بڑھ آئی تھی۔ وہ ایک کونے میں کھڑی ہو گئی۔ تبھی ایک عورت نے آگے بڑھ کر پوچھا:

''بیٹی! یہاں سے کون سے نمبر کی بس چلتی ہے؟''

یہ اُسے مخاطب نہیں کیا گیا تھا۔ اُس نے شش و پنج میں اپنا منہ پھیر لیا۔ بے وقوف ناسمجھ عورت، کیا وہ دیکھ نہیں سکتی۔ اُس کا شک اُسے چاروں طرف سے گھیر رہا تھا اور اُس کی آنکھیں جل تھل تھیں۔

ایک بس، سٹاپ پر آ کر رُکی تو سب سواریاں جو اتفاق سے عورتیں تھیں، اُس کی طرف لپکیں۔ وہ بھی بلا سوچے سمجھے بڑھی مگر قریب پہنچ کر ٹھٹھک گئی۔ اُس کے قدموں کو زمین نے جکڑ لیا۔ یہ بس عورتوں کے لیے تھی۔ کیا وہ سوار ہو سکتی ہے؟ وہ ٹھٹھکی کھڑی تھی۔ اچانک لیڈی کنڈکٹر نے سر نکال کر دیکھا۔

''کہاں جائیں گی آپ؟''

باوجود کوشش کے وہ اپنے حلق سے کوئی آواز نہ نکال سکی مگر اسی کشمکش میں وہ بس پر سوار ہو گئی اور کھڑکی کے قریب اُسے جگہ مل گئی۔

بس کے چلتے ہی عورتوں نے نقابیں اُلٹ لیں اور گرمی کی شکایت کرنے لگیں۔ وہ نقاب گرائے خاموش بیٹھی تھی۔

اچانک دائیں ہاتھ بیٹھی سواری نے اُسے مخاطب کیا:

''کہاں جاؤ گی؟''

وہ خاموش تھی اور شک میں پڑی تھی مگر سواری باتونی تھی، دوبارہ بولی:

''اُفوہ! آج تو غضب کی گرمی ہے۔ برقع بھی آگ ہو رہا ہے۔ اے بہن، نقاب اُلٹ لو۔ عورتوں سے کیا پردہ؟''

اُس کے حلق سے چیخ سی نکل گئی اور اُس نے نقاب کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنا منہ کھڑکی سے باہر نکال لیا۔

پتھر کے چہرے

وہ کافی دیر سے دکان پر ٹھٹکی کھڑی تھی۔ دیوار پر یہاں سے وہاں تک پتھر سے ترشے ہوئے چہرے آویزاں تھے... خوب صورت، بوڑھے، جوان، معصوم، مردوں کے، عورتوں کے، محبت کرتے، ناکام ہوتے... بہت سی مورتیاں تھیں۔ وہ حیران کھڑی انہیں دیکھتی رہی... کتنے خوب صورت، کتنے عظیم، کتنے متحرک اور جاندار۔ اسے تو یہ چہرے انسانی چہروں سے بھی زیادہ گداز اور زندگی سے بھرپور دکھائی دیئے۔ یہ تازگی اور خون کی جھلک نہ جانے کن انگلیوں نے ان میں ٹپکائی تھی... فنا کا خوف یا خود کو لازوال بنا دینے کی سستی خواہش یا خود پسندی یا نمائش... بوڑھی سوکھی انگلیاں......! نہیں نہیں...... اُس نے سر کو جھٹکا دیا... تخیل صرف خوب صورتیاں تراشتا ہے، بدصورتیاں نہیں۔ اور وہ تو بڑی جذباتی تھی۔ جذباتی رشتے استوار کر لینا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا اور اس وقت تو اس پر ایک عجیب پُراسرار جذباتی کیفیت طاری تھی۔ یہ لمحہ باقی لمحوں سے انوکھا تھا۔ اُس نے تصور میں ان سڈول مخروطی انگلیوں کو دیکھا اور اُس کا دل پسیج گیا۔

''قیمت...''

''چھ روپے۔''

''اتنا سستا۔'' بے اختیار اُس کے منہ سے نکل گیا۔

''جی ہاں۔'' دوکاندار نے فوراً بات پکڑی۔

''فن کا کمال دیکھیے..... اتنے سستے داموں آپ کو ایسی چیز اور کہیں سے نہ ملے گی.....''

''کِس نے تراشا ہے؟''

''اپنا ہی آدمی ہے۔'' دوکاندار نے بے وقعتی سے کہا۔

غصے، نفرت اور رحم کے ملے جلے جذبے سے وہ کانپنے لگی۔ شاید فن کی پذیرائی اسی میں ہے کہ وہ سستے داموں بکے اور عالیشان کوٹھیوں کے بے حد گریس فل کمروں میں سجایا جائے... شاید وہ بہت مجبور ہے... اس کا دل موم کی طرح پگھل گیا۔ اُس کا دل چاہا وہ سارا سامان خرید لے۔ مگر اُسے تو شاید اس کا چھٹا حصہ بھی نہیں ملے گا۔

اُس کے تخیل نے پھر جست بھری...... اور وہ، ایک تنگ و تاریک کمرہ...... فن کے کٹھن مرحلے سے گزرتا ہوا، ایک بجھا بجھا مایوس و مظلوم چہرہ جو اپنا خونِ جگر ان پتھروں پر ٹپکا رہا تھا۔ وہ چونک گئی۔ اس کا جی چاہا وہ اس کی کسی طرح تشفی کرے۔ اسے اپنا سب کچھ دے ڈالے۔ اُس نے کاؤنٹر پر چھ روپے رکھ کر لرزتے ہاتھوں سے وہ لفافہ اُٹھا لیا۔ نرم ہتھیلی پر سخت لمس۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ وہ بازار میں سے گزرتے ہوئے کسی دوکان پر یوں جرأت سے رُکی تھی۔ ورنہ تو وہ ہر روز اپنے بدرنگ برقعے میں لپٹی بڑی بے تعلقی سے چھپاک سے بازار سے گزرتی اپنے گھر کے تنگ و تاریک زینے تک پہنچ جاتی۔ لمبے زینے کو وہ ہانپتی کانپتی طے کرتی۔ گویا ایک دنیا سے دوسری دنیا میں آتی۔

یہ مرحلہ واقعی کٹھن تھا۔ باہر کی دنیا سے اس کا ناطہ ٹوٹ جاتا تھا اور وہ ایک زینے سے اوپر اپنی چھوٹی سی مظلوم و مجبور دنیا میں چھوٹی چھوٹی خواہشوں، چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور چھوٹی چھوٹی محبتوں کے درمیان ہوتی۔ زینہ طے کر کے اُسے ہمیشہ سکون ملتا۔ وہ اپنا بدرنگ برقع دیوار میں لگی کیل سے ٹانگ دیتی، کپڑے بدلتی، ہاتھ منہ دھوتی۔ اُس کی ماں کھانا نکال کر میز پر رکھ دیتی اور اس کی بہن اُس کے کپڑے سمیٹ دیتی۔ کھانے کے دوران وہ گھر کی ضرورتوں کے بارے میں سوچتی... کتنا خرچہ بڑھے گا، کتنی رقم کی ضرورت ہوگی، فالتو رقم کے لیے اُسے کتنی فالتو محنت کرنا پڑے گی؟

اُس کی ماں اُسے ہولے ہولے پنکھا جھلتی۔ وہ گاہے گاہے نیچے دیکھتی... خوب صورت شاندار جگمگاتا بازار۔ اس کا چھوٹا بھائی پیچھے سے آ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیتا۔ وہ اسے کھینچ کر آگے لاتی۔ کینوس کے پھٹے جوتوں میں سے اُس کے ننھے منے پاؤں جھانکتے۔

''اس بار تنخواہ پر منے کے لیے ضرور جوتے لینے ہیں۔'' وہ کہتی۔

''اور ماں اس بار تم پچاس روپے الگ نہیں کروگی۔''

''نہیں بیٹی'' ماں فکرمندی سے کہتی۔ ''وہ رقم تیرے بیاہ کے لیے ہے۔''

یہ الفاظ اُس کے جذبات کو گدگدا دیتے۔ کیا سچ مچ وہ کسی دن دلہن بنے گی۔ وہ جگمگاتے زیور اور جھلملاتے کپڑے کہاں سے آئیں گے؟۔ ان پچاس روپوں کو کہاں تک ملٹی پلائی کرنا ہوگا؟ وہ سوچتی اور ہنس دیتی۔ ماں کو شاید کسی معجزے کا انتظار تھا۔ مگر تب تک تو وہ شاید بوڑھی ہو جائے گی۔

اس چھوٹے سے کمرے میں اس کھڑکی کے پاس بیٹھے وہ بہت سی باتیں سوچتی۔ وہ کھڑکی اس بازار کی جانب تھی۔ کھڑکی میں ایک بوسیدہ سی چق پڑی رہتی۔ اس کھڑکی کے پاس بیٹھے وہ اپنے سارے کام بھگتاتی... پرچے دیکھتی، کاپیاں چیک کرتی، چھوٹے بہن بھائیوں کو پڑھاتی، آلو چھیلتی، نٹنگ کرتی، محبت اور نفرت کرتی، انتظار کرتی۔ یہ کھڑکی اس کے اور باہر کی دنیا کے درمیان ایک رابطہ تھی۔ ویسے ایک رابطہ بُوا زینب بھی تھی۔ ہفتے میں ایک دو بار وہ ضرور اپنا برقع پھڑ پھڑاتی ان کے گھر آتی۔ ماں اُس کی خوب آؤ بھگت کرتی۔ پھر وہ سامنے کے چھوٹے سے نیم تاریک کمرے میں بیٹھ کر کچھ کُھسر پُھسر کرنے لگتیں۔ بیچ بیچ میں بُوا زینب اپنی بطخ کی سی گردن اُٹھا کر اُسے بھی دیکھتی جاتی۔

شروع شروع میں بوا زینب کو دیکھ کر اس کے دل میں ہلچل سی مچ جاتی تھی۔ وہ وہاں بیٹھے بیٹھے خوابوں کی کسی حسین وادی کی طرف نکل جاتی۔

لیکن پھر یہ سب کچھ ایک معمول بن گیا۔ بیاہ کا لفظ اپنی لطافت کھو بیٹھا بلکہ اس لفظ سے وہ قدرے چڑنے لگی تھی۔ اکثر و بیشتر ان کے گھر کے لمبے تاریک زینے کو طے کرتے انجان چہروں والے مہمان آتے۔ گھر میں ہلچل سی مچ جاتی۔ ان کے سامنے اس کی خوبیاں بیان کرتے کرتے ماں کا سانس پھول جاتا۔ تب وہ آسمانی رنگ کی اوڑھنی سر پر ڈالے ہاتھوں میں ٹرے اُٹھائے اُن کے سامنے آتی۔ اس وقت اُسے یہ جانا پہچانا کمرہ اور وہ روشنی اگلتی کھڑکی سب بیگانے سے نظر آتے۔ خودداری اور اَنا کا دم گھٹنے لگتا۔

مہمان آتے اور چلے جاتے۔ اب تو یہ ٹرے اُٹھاتے اٹھاتے اُس کے بازو شل ہو گئے

تھے۔ ہر بار اُسے محسوس ہوتا جیسے وہ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ جائے گی۔ مگر ہر بار ماں اُسے سنبھال لیتی۔ اُسے ماں پر ترس آتا۔ وہ خواہ مخواہ ہلکان ہو رہی تھی۔ وہ بیاہ نہیں کرے گی۔ اور وہ ایک نئے تاریک گھر کو جنم نہیں دے گی۔ وہ ماں جیسی سسکتی، بلکتی زندگی ہرگز بسر نہیں کرے گی۔ وہ اکثر ماں کو دل بہلاوے سے نکالنے کے لیے کہتی۔

''ماں سلمٰے کا خیال کرو میرا پیچھا چھوڑ دو۔ مجھے نفرت ہے ان لالچی لوگوں سے۔''

ماں کی نگاہیں اُس کے چہرے پر جم جاتیں جیسے اس کے بھیتر کو ٹٹول رہی ہوں۔ وہ کھسیانی سی ہو کر ماں کے سامنے سے ہٹ جاتی۔ تب وہ اس کھڑکی میں آتی۔ یہی اُس کی مونس و غم خوار تھی۔ یہی اُس کی تنہائی کی ساتھی تھی... تنہائی جو اُس کے چاروں طرف اُمنڈتی چلی آ رہی تھی، تنہائی جو اُس کے اندر تھی اور اس کے باہر تھی۔ وہ اپنی اس چھوٹی سی دنیا میں کھوئے رہنا چاہتی تھی۔ وہ سب کیلئے تھی، مگر اُس کا اپنا آپ کہاں تھا۔ ایسا کیوں تھا کہ وہ کبھی کبھی اپنے آپ کو کھوجنے لگتی تھی۔ اُس کے سارے جذبات گڈ مڈ سے ہو جاتے، بہت سی نفرتیں جاگ جاتیں، اُسے اپنا آپ نامکمل سا دکھائی دیتا... آخر وہ کیوں تھی؟ کس لیے تھی؟ اور یہ کیڑے مکوڑوں جیسے بے حیثیت و بے وقعت انسان، آخر ان کی زندگیوں کا مصرف کیا تھا؟ صرف تاریکیوں کو جنم دینا؟ اس کے چہرے پر اندھیرا سا پھیل جاتا۔ مایوس و نامراد وہ کھڑکی سے نیچے دیکھتی۔ اُس کے سامنے جیسے کوئی رنگین فلم چلا دیتا... بڑا سا خوبصورت بازار، جگمگ کرتی دوکانیں، شوکیسوں میں رکھے شاندار قیمتی ملبوسات، چمکتے دمکتے زیورات، خوبصورت قیمتی اشیاء، مٹھائیاں، پھل، آئس کریم، چاٹ، ملک شیک، کاسمیٹکس، کھلونے اور ان سب قیمتی اشیاء کو خریدنے والے گاہک، ہجوم در ہجوم، خوبصورت، بدصورت، انوکھے، جوان، بوڑھے، مغرور چہرے، لمبی کاروں کے کھلتے دروازے اور ان میں سے نکلتی گڑیوں جیسی نرم و گداز، خوب صورت عورتیں، جن کی زندگیاں شوکیس میں رکھے ماڈلز کی طرح محفوظ تھیں۔ یہ سب کس دنیا سے آئے تھے؟ ان کا خدا کون تھا....؟؟۔ وہ ہر چیز کے ساتھ دو قدم چلتی (وہ تنہا تھی) مگر اُس کے اندر سے کوئی اُس پر ہنستا۔

کوئی نہیں......کوئی نہیں......

ماں کو اس کھڑکی سے چڑ تھی۔ جب بھی موقع ملتا وہ دھڑ دھڑا کر اس کے کواڑ بند کر دیتی۔

''نیچے مت دیکھو'' وہ کہتی۔

وہ نیچے دیکھنے سے ڈرتی تھی۔ مگر بند کھڑکی کے سامنے اسے اپنا آپ بھی کسی مقفل کال کوٹھڑی کی طرح دکھائی دیتا۔ وہ کھڑکی کھول دیتی اور اس کی روشنی میں یوں لمبے لمبے سانس لیتی جیسے اپنے اندر کے اندھیرے کو دور کر رہی ہو۔ یہ کھڑکی اس کے لیے جامِ جم سے کم نہ تھی۔ وہ اس کھڑکی میں بیٹھ کر محبت کرتی تھی، نفرت کرتی تھی اور جب دل پر مایوسیوں کا سایہ پڑتا تو وہ اس کھڑکی میں چپکے چپکے دو آنسو بہا لیتی۔ وہ اس کھڑکی میں بیٹھ کر سپنوں کے محل بھی سجاتی تھی اور انتظار بھی کرتی تھی... اجنبی انجان لمحوں کا۔ جب سردیوں کی اداس کر دینے والی بارش ہلکے ہلکے سروں میں برستی تو وہ اپنے سرد ہاتھ کی ٹھنڈی ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکائے انتظار کرتی۔ اس کی آنکھیں کہیں دور دیکھتیں۔ اس کے تصور میں ایک 'اپنا' ہے... آخر کبھی نہ کبھی؟ وہ سوچتی اور یہ بڑی مستحکم سوچ تھی۔ وہ سوچ کی نازک ڈور پر قدم رکھتی، اس سرے سے اس سرے تک چلی جاتی... اور 'اُسے' پالیتی۔

لیکن یہ جذباتی لمحہ بڑا مختصر ہوتا۔ پھر اچانک سوچ کی ڈور اُس کے پاؤں تلے ٹوٹ جاتی اور وہ نیچے کہیں اتھاہ گہرائی میں گر جاتی۔

کوئی نہیں...... کوئی نہیں! کوئی اُس کے قریب سے تالی بجاتا گزر جاتا۔ اُس کی کنپٹیوں سے چنگاریاں سی پھوٹنے لگتیں۔ انسانوں کے چہرے اُسے پتھر کے دکھائی دیتے۔ وہ غنودگی کے عالم میں اپنے چاروں طرف دیکھتی۔ اُس کا دل چاہتا، وقت تھم جائے مگر وقت کا بے رحم پہیہ تیزی سے اُسے کچلتا ہوا گزر رہا تھا۔ وہ اور اُس کے گرد و پیش کی ہر شے لمحہ بہ لمحہ بوڑھی ہوتی جا رہی تھی۔ پھر بھی لوگ خوش اور ہنستے نظر آتے تھے... ہجوم در ہجوم اور اس ہجوم کے خیالی قدموں تلے وہ کچلی جا رہی تھی۔

فنا کا خوف اُسے چھوٹی سی تاریک دنیا سے باہر کھینچ لاتا اور اُس کے ہاتھ سے سب کچھ چھوٹ جاتا۔ ''بچاؤ! بچاؤ'' کوئی بے آواز چیختا اور تب اُس کی آنکھوں کے کونے بھیگ جاتے۔ ماں اس کی بھیگی بھیگی آنکھوں کو دیکھ کر پریشان ہو جاتی تھی۔ تب گھر میں اجنبی مہمانوں کی آمد میں اضافہ ہو جاتا اور ٹرے کا بوجھ اُس کی اَنا کے گلے میں پھانسی کا پھندا بن جاتا۔ وہ تھک گئی تھی، مگر ماں نہیں تھکتی تھی۔ اُسے ضد سی ہو گئی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کے لیے ضرور

خوشیاں خریدے گی... اس کی مجبور اور بے بس ماں۔ مگر یہ آنسو تو بس کبھی کبھی اُس کی آنکھوں میں آتے تھے ورنہ تو وہ سب کے درمیان خوش اور مطمئن رہتی تھی۔

اور اس دن جب بازار سے گزرتے ہوئے اُس نے پتھر کا وہ نمونہ خریدا تو وہ بہت ہلکی پھلکی اور خوش تھی۔ اُس کے چہرے پر طمانیت کی روشنی تھی۔ وہ زینہ دھڑ دھڑاتی اوپر چڑھی تھی۔ اس کی ماں دوسرے کمرے میں نل کے پاس برتن لیے بیٹھی تھی۔ تب اُسے خیال آیا کہ ماں اُسے دیکھ کر کیا کہے گی، یہ تو اُس نے سوچا ہی نہ تھا، اور وہ اسے رکھے گی کہاں؟ ماں یقیناً اُسے ناپسند کر دے گی۔ آخر اُس نے یہ کیوں خریدا؟ وہ ٹھٹھک سی گئی۔ جیسے انجانے میں اس سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔ کیا اُس کے دل میں کوئی چور تھا؟ مگر اُس نے اس قابلِ نفرت خیال کو جھٹک دیا۔ یہ تو محض...؟ تبھی اُس کی ماں دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی کمرے کے اندر آ گئی۔ اس کے چہرے پر عجیب گومگو کی کیفیت تھی۔ جیسے وہ کچھ کہنے کو بے چین ہو اور کہہ بھی نہ پا رہی ہو۔

''کیا ماں جان گئی ہے؟'' خوف سے اُس کا دل دھڑ کنے لگا۔

لیکن تبھی اُس کی نگاہ سلمے پر گئی۔ وہ بھی کمرے میں موجود تھی۔ کاہی رنگ کے بل باٹم میں ملبوس قدرے جھجکی جھجکی، شرمائی شرمائی سی۔ اس کی حیران نگاہیں بے اختیار نل کے نیچے چلی گئیں۔ پلاسٹک کی ٹرے میں چائے کی پیالیاں اُس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ وہ ماں کے ہونٹوں پر پھیلی ہلکی سی بے چین مسکراہٹ کا مطلب سمجھ گئی۔ تب اس کے چہرے پر غبار سا آ گیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی لق و دق صحرا میں تن تنہا کھڑی ہے اور اُس کا وجود ریت کے ذروں کی طرح بکھر چکا ہے۔ اُسے اپنے وجود کو سمیٹنا تھا، اپنے ادھورے وجود کو مکمل کرنا تھا، اپنی تشنہ روح کو بہلانا تھا، اپنی سسکتی آرزوؤں کا گلا گھونٹنا تھا۔

اُسے بہت سے کام کرنا تھے۔ اُس نے پلاسٹک کی ٹوکری کو ٹٹولا۔ ''وہ'' وہاں تھا... نرم ہتھیلی پر سخت سا لمس۔ تب اُس نے محسوس کیا جیسے طوفان تھم گیا ہے۔ سب کچھ اپنی جگہ پر ٹھہر گیا ہے اور اُس کی انگلیوں میں کسی نے اپنی مضبوط اُنگلیاں ڈال دی ہیں۔

پچھتاوا

اس کے لیے مشکل یہ تھی کہ وہ اس راستے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار نہیں کر سکتی تھی۔ یہی ایک تنہا صاف اور ستھرا راستہ تھا جو اُس کے گھر سے آفس اور آفس سے گھر تک جاتا تھا۔ اس طرح لامحالہ اُسے دن میں دو مرتبہ اس راستے سے گزرنا پڑتا۔ جب بس یا رکشہ میں وہ ڈسپنسری کے پاس سے مڑتی ہوئی گلی کے قریب سے گزرتی تو وہ فوراً اپنی نظریں پلٹا دیتی۔ لیکن ایسا کرنے کے باوجود اس مجرمانہ احساس سے چھٹکارا پانا ناممکن تھا کہ وہ دراصل گلی سے نہیں خود اپنے آپ سے نظریں چرا رہی ہے۔

وہ قصداً کھڑکی کے قریب نہ بیٹھتی۔ لیکن دور بیٹھ کر بھی وہاں سے گزرتے ہوئے شدید بے چینی محسوس کرتی۔ دیکھنے اور نہ دیکھنے کی متضاد خواہش اُس کے لیے شدید ذہنی اور اعصابی دباؤ کا باعث بن جاتی۔ کئی بار یہ کشمکش سنگین صورت اختیار کر جاتی اور وہ چہرہ گھما کر اپنی نظریں گلی پر ٹکا دیتی۔ اُس وقت اُسے محسوس ہوتا جیسے اس نقطے پر پہنچ کر کششِ ثقل بڑھ گئی ہے اور وہ بے اختیار زمین کی طرف کھنچی چلی جا رہی ہے۔ جب بس کھڑکھڑاتی یا رکشہ فراٹے بھرتا آگے بڑھ جاتا تو وہ آرام و سکون کا گہرا سانس لیتی۔

اُسے اس گلی اور اس مکان سے نفرت ہو چکی تھی۔ حالانکہ وہ اس گلی میں اور اس مکان کی مٹی میں لوٹ پوٹ کر بڑی ہوئی تھی اور اس مٹی کی خوشبو اب بھی اُس کے جسم سے اُٹھتی تھی لیکن اس نفرت کا صاف سیدھا جواب بھی اُس کے پاس موجود تھا۔ اُس نے اس مکان میں اپنی بے حد پیاری ماں کو مرتے اور اس منحوس گلی سے اُس کے جنازے کو نکلتے دیکھا تھا۔ اس کی نفرت بجا تھی، لیکن پھر اُس کے دل میں کبھی کبھی یہ کیسا کھٹکا سا ہوتا تھا جیسے یہ سب کچھ محض

وہم ہو اور وہ اپنے آپ سے جھوٹ بول رہی ہو۔

وہ مکان تو ایک حصار کی طرح اُس کے گرد کھنچا تھا اور وہ اس میں سے باہر نہیں آ سکتی تھی۔ ماں کی اچانک موت کے بعد بھی کافی عرصہ وہ اسی مکان میں رہی تھی اور وہ دن اُسے ایک عذاب کی طرح اپنے وجود پر لدے محسوس ہوتے تھے۔ ان دنوں وہ بالکل تنہا تھی۔ نہ اس کا کوئی سنگی تھا نہ ساتھی۔ ابا ہمیشہ کے تنہائی پسند تھے۔ وہ اس کی دلجوئی کیا کرتے۔

انہیں منحوس ایام میں اسے پہلے پہل فیروز لنگڑے کا خیال آیا تھا اور پھر تو جیسے یہ خیال اُس کے اعصاب پر چھا گیا تھا۔ اُٹھتے بیٹھے وہ اس کے متعلق سوچنے لگی اور دبے دبے محسوس کرنے لگی جیسے وہ کسی بات پر پچھتا رہی ہو۔ لیکن کس بات پر؟ اس نے کون سا جرم کیا تھا؟ کئی بار وہ تلخ ہو کر خود کو ڈانٹ دیتی۔ جس دن اس کا بیاہ ہوا اور وہ اپنے باپ سمیت نئے گھر اور نئے ماحول میں آ گئی تو اُس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ان تکلیف دہ سوچوں سے اسے نجات مل گئی تھی۔ ایک سال ہنسی خوشی میں گزر گیا۔ اُسے کبھی پہلے گھر کا خیال نہیں آیا۔

پھر یوں ہوا کہ اُس کا خاوند ملک سے باہر چلا گیا اور اپنی تنہائی سے بچنے کے لیے اُس نے ملازمت اختیار کر لی۔

اب مشکل یہ پڑی کہ آفس سے گھر، اور گھر سے آفس کا راستہ صرف ایک تھا اور وہ اس پرانی گلی کے سامنے سے گزرتا تھا۔ یوں اُسے دن میں دو بار وہاں سے گزرنا پڑتا اور وہ نئے سرے سے اس گلی اور اس مکان کے خیالی چکر میں گرفتار ہو گئی تھی۔

دفتر میں سارا وقت وہ آنے والے لمحے کے خیال سے بے چین رہتی اور جب گھر پہنچتی تب بھی اُس کی طبیعت بے حد نڈھال اور مضمحل ہوتی۔ باورچن کے کئی مرتبہ بلانے پر وہ کھانے کی میز پر آتی۔ بہت دنوں کے غور و خوض کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اس کی اس بے چینی کی وجہ تنہائی ہے۔

اُس کے پاس اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں ہیں، وہ ایک آئیڈیل شوہر کی بیوی ہے، زندگی نے اپنی ہر خوشی ہر مسرت و آرام سے اُسے نوازا ہے، کسی بات کی کمی نہیں... ایسے اچھے حالات میں قنوطیت پسندی... اُس کی وجہ تنہائی ہی ہو سکتی ہے...... تنہائی ہی اسے حیران کن ماضی کی طرف دیکھنے اور سوچنے پر مجبور کرتی ہے وہ اصل میں چاہتی ہے کہ دوبارہ اس مکان میں جا کر

رہے...... پچھلے دن لوٹ آئیں...... اُس کے ساتھ ماں ہو، ابا ہوں اور...... آگے کی سوچ وہ منقطع کر دیتی۔ اگر وہ تنہا نہ ہوتی تو مردہ ماضی کو یوں منہ نہ لگاتی۔ تنہائی سے بچنے کے لیے وہ اپنے شوہر کو لمبے لمبے خط لکھتی اور اصرار کرتی کہ وہ اسے بھی اپنے پاس بلا لے۔

آخر ایک مبارک صبح اس کی زندگی میں طلوع ہوئی۔ اُسے اپنے شوہر کا خط ملا جس میں یہ خوشخبری تھی کہ وہ عنقریب اُسے اپنے پاس بلانے والا ہے۔ اُس دن وہ بے حد خوش تھی۔ زندگی کی ہر بلندی اُس کے قدموں کی دُھول بن چکی تھی اور اب وہ ایک نئی پرواز کے لیے پر تول رہی تھی... وہاں اپنے شوہر کے پاس وہ کتنی خوش، کتنی مگن اور مسرور رہے گی...... زندگی کا کوئی دکھ اُس کے پاس پھٹکنے کی جرأت بھی نہ کر سکے گا۔

اُس دن رکشہ ایک زناٹے کے ساتھ گلی کے سامنے سے گزر گیا اور اُسے کچھ یاد ہی نہیں آیا لیکن ذرا آگے جا کر اچانک اُسے خیال آیا۔ اُس نے گھوم کر دیکھا اور اُس کا دل کسی نامعلوم خوف سے دھڑ دھڑ کرنے لگا۔

اسی رات ابا نے اُسے اپنے کمرے میں طلب کیا۔ ابا کو جب کوئی اہم فیصلہ کرنا ہوتا تو اُس سے ضرور مشورہ کرتے۔ دراصل اُن کے قریب اور کوئی ایسی مخلص اور ہمدرد ہستی نہیں تھی جو اُن کے فیصلوں پر ہمدردی سے غور کرتی۔ ایک صرف وہ تھی جو ابا کے ہر فیصلے کو قبول کر لیتی اور یوں ابا اپنے بڑھاپے میں بھی ایک قوت محسوس کرنے لگتے تھے۔ اُس دن جب وہ ابا کے سامنے بیٹھ چکی تھی تو ابا خلافِ عادت دیر تک خاموش بیٹھے سگار پیتے رہے، جیسے وہ کسی دوٹوک فیصلے پر نہ پہنچ پا رہے ہوں۔ آخر انہوں نے سر اُٹھایا اور دھیمے لہجے میں بولے:

''بیٹی، میرا خیال ہے تمہارے جانے سے پہلے ہم وہ مکان بیچ دیں۔ اس طرح جو رقم حاصل ہوگی اُس سے میں کسی نئی آبادی میں اچھا سا مکان تمہارے نام بنوا دوں گا۔ اب وہ پرانا مکان بے کار ہی پڑا ہے۔''

ابا کچھ دیر چپ رہ کر پھر گویا ہوئے:

''فیروز کی طرف سے ایک ذرا سی آس تھی، لیکن اب سب ختم ہو چکا ہے۔''

وہ کچھ نہیں بولی۔ اُس پر ایسا سناٹا طاری ہو گیا تھا جس نے اُس کے گلے کو خشک اور اُس کی زبان کو گنگ کر دیا تھا۔ اُس نے سر جھکائے صرف اتنا کہا تھا۔

''جیسے آپ کی مرضی ابا۔''

اور اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ اُس رات وہ بالکل نہ سو سکی۔ ساری رات وہ کروٹیں لیتے ہوئے سوچتی رہی۔ اُس نے ہمیشہ اس مکان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی تھی، اب جب کہ مستقل طور پر اُسے اس مکان سے نجات مل رہی تھی تو وہ کیوں اپنے آپ کو رنجیدہ محسوس کر رہی تھی۔ ساری رات اُس پر ایک عجیب سی رِقت طاری رہی اور وہ بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں کو روک سکی۔

صبح وہ اُٹھی تو اُس کا سر بوجھل اور دل بے چین تھا۔ آفس جاتے ہوئے جب وہ وہاں سے گزری تو اُس نے پہلی بار اس گلی سے ایک جذباتی وابستگی محسوس کی۔ واپسی پر وہ بلا تامل گلی کے قریب اسٹاپ پر اُتر گئی۔ اُسے خود اپنی اس جرأت پر تعجب تھا۔ اُس کے بیگ میں چابیوں کا گچھا تھا۔ وہ گلی کے جانے پہچانے راستے پر جچے تُلے قدموں سے چلنے لگی۔ اُسے ایک لمحے کو بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ عرصے بعد یہاں آئی ہے۔ اُسے گزرا ہوا وقت کل کی بات لگ رہا تھا۔ گلی سنسان پڑی تھی۔ بغیر کسی تردد کے وہ مکان کے سامنے جا پہنچی، تالا کھولا اور مکان کے اندر داخل ہو گئی۔

اُس وقت اُس کے جذبات میں بڑی شدت تھی اور اسی شدت میں اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے یا کیا محسوس کر رہی ہے۔ سارا مکان دُھول سے اَٹا پڑا تھا، اُس کی فضا میں کٹھور پن تھا اور وہ خود کو اجنبی اور غیر محسوس کر رہی تھی۔

وہ ڈری ڈری سارے گھر میں گھومی، دیوار دیوار کو چھوا۔ ٹھنڈی اور بے حس دیواریں نہ کچھ کہہ رہی تھیں نہ کچھ سن رہی تھیں۔ پھر بھی وہ بہت کچھ محسوس کر رہی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں گئی اور پھر ڈر کر یوں باہر نکل آئی جیسے اُس نے وہاں اپنی دوسری صورت دیکھ لی ہو۔ اُس کا دل خوف سے کانپ رہا تھا۔ یہ کیسا خوف تھا جو ہولے ہولے اُس پر طاری ہوتا جا رہا تھا۔

اُس نے ڈرتے ڈرتے کچن کا دروازہ کھولا۔ سامنے پیڑھی پر اُسے ماں کا ہیولا نظر آیا۔ وہ نظریں گڑوئے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی اور اُس کی تیز نظریں اُس کے دل کے آر پار ہو کر کسی بھید کو ٹٹول رہی تھیں۔ بدحواسی میں اُس نے کچن کا دروازہ بھی جلدی سے بند کر دیا۔

سارے گھر میں جیسے کچھ تلاش کرتی اب وہ صحن میں ایک طرف بنے پانی کے چوبچے کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔ حوض خالی تھا اور اُس میں جمی سبز کائی اب سیاہ رنگ اختیار کر گئی تھی۔ جونہی اُس نے جھک کر اندر دیکھا، حوض کی خالی تہہ میں اُسے فیروز لنگڑے کا چہرہ دکھائی دیا۔

بہت عرصہ پہلے اُس نے ایک بار فیروز کو اس حوض میں گرتے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ڈر کر اپنے کمرے میں بھاگ گئی تھی۔ فیروز کی خوش قسمتی سے منگو جمعدار اُسی وقت آ نکلا اور اُس نے فیروز کو بچا لیا تھا۔ لیکن اچانک گرنے سے فیروز کے پاؤں میں کچھ ایسا نقص ہو گیا تھا کہ وہ لنگڑا کر چلنے لگا تھا۔ سب نے اسے ایک حادثہ سمجھا تھا اور وہ خود بھی سب کچھ بھول گئی تھی۔

اپنے ضمیر میں کوئی چبھن محسوس کیے بغیر فیروز کو اُس نے بار بار لنگڑا کہہ کر پکارا تھا۔ لیکن آج اُس نے پرانے جھوٹ کو سچ سے علیحدہ کر دیا تھا اور پہلی بار اپنے آپ پر شرمندہ تھی۔

وہ چوبچے سے ہٹ آئی۔ مگر اب فیروز کا دھلے کپڑے جیسا بے خون چہرہ گھر کے کونے کونے سے اُبھرتا دکھائی دے رہا تھا۔

اماں کے حکم پر فیروز لنگڑاتا ہوا دن میں کئی بار سیڑھیاں چڑھتا اور اُترتا۔ کپڑے کے میلے سے جزدان میں سیپارہ رکھے مسجد میں جاتا۔ دالان میں تینوں وقت بیٹھا بے چارگی سے کھانے کا انتظار کرتا۔ ماں کو بڑی دیر بعد اُس پر رحم آتا اور وہ اُن کی گالیوں کی بوچھاڑ میں سر جھکا کر کانپے جاتا۔

جب وہ تعلیمی میدان میں سربلندی کے جھنڈے گاڑتی آگے بڑھ رہی تھی تو فیروز میٹرک میں فیل ہو گیا۔ وہ تو اس کی شکست پر خوش تھی، لیکن ماں اپنے بنے بنائے منصوبے کے یوں خاک میں مل جانے پر اُس کے خون کی پیاسی ہو گئی تھی۔ دن میں سینکڑوں پھٹکاریں اُسے سننا پڑتیں۔ بعض اوقات دو وقت کا کھانا بھی ماں اُسے دینا بھول جاتیں۔

ابا گھر کی سیاست میں کبھی حصہ نہ لیتے تھے، لیکن فیروز کی وجہ سے اکثر ماں کے ساتھ اُن کی تلخ کلامی ہو جاتی۔ فیروز سے اُس کی نفرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ وہ ہر چیز پر اپنا تنہا حق سمجھتی تھی، حتیٰ کہ ابا کے کبھی کبھی فیروز کو ملنے والے پیار پر بھی۔

لیکن ایک دن یہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ اُس دن فیروز گھر لوٹ کر نہیں آیا۔ اگلے دن بھی نہیں، اور اُس سے اگلے دن بھی نہیں، اور پھر کبھی نہیں۔ کسی نے اُسے نہیں ڈھونڈا، کسی نے اُسے یاد نہیں کیا۔ ابا اُس کے منتظر تھے مگر زبان سے انہوں نے بھی کچھ نہیں کہا تھا۔ رات کو سوتے ہوئے اُس نے اپنی زندگی میں ایک ہلکا سا خلا ضرور محسوس کیا، اور اس خلا کو ماں کی موت نے گہرا کر دیا تھا۔

لیکن اُس نے ہمیشہ اس احساس سے نفرت کی تھی۔ فیروز سے اُسے کبھی دلچسپی نہ رہی تھی۔ نہ اُس نے اُس کے لیے کبھی اپنے دل میں کوئی لگاؤ محسوس کیا تھا۔ پھر اس وقت اُسے اس گھر میں فیروز کے ہر جگہ موجود ہونے کا اتنا گہرا احساس کیوں ہو رہا تھا؟ کیا یہ اُس کی کسی خفتہ مگر شدید خواہش کا عکس تھا؟

وہ سارے گھر میں گھومی تھی۔ سارے کمروں کو باری باری کھول کر دیکھا تھا۔ پہلے ہر کمرہ اپنی الگ پہچان رکھتا تھا... کوئی ڈرائنگ روم تھا کوئی ڈائننگ روم، کوئی سونے کا کمرہ تھا تو کوئی اسٹور روم۔ لیکن اب ان میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا تھا... سب کی حالت ایک جیسی تھی۔ سب خالی اور ویران تھے اور ہر کمرے میں چمگادڑوں نے ڈیرے جما رکھے تھے، اور مکڑیوں نے جالے تن دیے تھے۔ اُس نے سب کمروں کے دروازے احتیاط سے بند کر دیے... اب آنے والی کل کو کوئی اور انہیں کھولے گا۔ یہ دیواریں اجنبی اور نئی آوازیں سُنیں گی اور تب وہ بہت دور، کہیں اور ہو گی۔

وہ پھر آنگن میں آ گئی تھی۔ اب اُس کے سامنے ایک ایسا کمرہ تھا جسے ابھی تک اُس نے نہیں کھولا تھا۔ یہ کمرہ سب کمروں سے چھوٹا، کم روشن اور کم ہوادار تھا۔ اُس کی چھت نیچی تھی... یہ کمرہ فیروز کا تھا۔ اس کمرے کو کھولتے ہوئے وہ ان جانا سا خوف محسوس کر رہی تھی۔ کمرے سے دور آنگن کی دیوار کے ساتھ لگے کھڑے اس نے کئی بار محسوس کیا جیسے کمرے کے اندر کوئی لنگڑاتا ہوا چل رہا ہے۔ وہ اپنے اس وہم پر ہنسی، اور اس نے آگے بڑھ کر دھول بھرے دروازے پر ہاتھ رکھ دیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اُسے دھکا دے کر کھول دیتی، وہ ٹھٹک گئی۔

کمرے کے اندر سے کسی کے لمبے لمبے سانس لینے کی صاف اور واضح آواز آ رہی

تھی۔ جیسے کوئی تنہا اندر پڑا بخار میں پھنک رہا ہو۔ وہ گھبرا کر دروازے سے دور ہٹ گئی۔

''خدا جانے فیروز اب کہاں ہوگا، اور کس حال میں ہوگا۔''

اُس نے پہلی بار بالکل اچانک طور پر فکرمندی سے سوچا اور اُس کے دل میں کئی بیتے دکھ جاگ اُٹھے۔ وہ اپنے سینے میں درد کی ٹیس محسوس کر رہی تھی اور اس کے ساتھ کسی کو پا لینے کی زبردست کسک۔ لیکن کہیں کچھ بھی نہیں تھا اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ اس بند کمرے کو کبھی اور کسی بھی صورت میں نہیں کھول سکتی۔

وہ دوبارہ چوبچے کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے دونوں ہاتھ حوض کی سوکھی دیواروں پر ٹکے تھے۔ ایک دن اسی چوبچے میں اُس نے فیروز کو دھکا دے کر گرایا تھا۔

پانی میں گر کر فیروز زندہ رہا تھا یا مر گیا تھا؟ اِس انوکھے سوال پر اس کے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔ بعد کے تمام واقعات ایک واہمہ میں بدل گئے۔ ایک زبردست اُلجھن میں پڑ گئی۔ اُس کے پاس اس وہم کو جھٹلانے کا کوئی جواز موجود نہ رہا تھا۔ لیکن پھر اچانک اُس نے سوچا اگر وہ مر گیا تھا، تو اب اس نے کمرے کے اندر کس کو سانس لیتے اور چلتے پھرتے محسوس کیا تھا؟

لیکن اس کا یہ استدال بھی اُسے حیرت زدہ کر گیا۔ وہ حیران اور خوف زدہ تھی اور سب سے بڑا ذہنی صدمہ تو اُسے اُس وقت پہنچا جب اُس نے محسوس کیا کہ وہ کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہی۔ اُسے اپنے سر پر منوں بوجھ محسوس ہو رہا تھا اور اس بوجھ تلے اُس کا ذہن پاش پاش ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اچانک تیز قدموں سے صحن عبور کرتی وہ باہر گلی میں نکل آئی۔ اُس نے ویران اور خالی گھر کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا (اندر کوئی سانس لے رہا تھا)...... وہ جلدی جلدی ویران گلی کو عبور کرنے لگی۔

تب یوں تیزی سے چلتے ہوئے اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی آنکھوں سے ذو جلتے ہوئے آنسو اُس کے رخساروں پر لڑھک گئے ہیں۔

پناہ گاہ

پھوپھی زینب اس پناہ گاہ سے نکلنے کو کبھی تیار نہیں ہوتیں۔ ان پر سب کو ترس آتا ہے، اگر نہیں آتا تو اُنہیں خود اپنے آپ پر ترس نہیں آتا۔ اب بھی کبھی کبھار جب وہ باتیں کرنے کے موڈ میں آ جائیں تو وہی پرانا قصہ چھیڑ بیٹھتی ہیں اور بڑے جذباتی انداز میں تمام تر تفصیل بیان کرتی ہیں اور جب وہ قصے کے اس حصے پر پہنچتی ہیں کہ کیسے یوسف پھوپھا ان کے گھٹنوں پر جھک گئے اور اُن کے پیروں کو آنسوؤں سے بھگو دیا تو ان کی آنکھیں جھلملا سی جاتی ہیں۔

''ہاں بھئی اس گناہ کا بوجھ بھی مجھے سمیٹنا پڑا۔ اب تک توبہ استغفار پڑھتی ہوں، خدا معاف کرے مجھے۔ مگر وہ ایسے ہی تھے ...تمہارے پھوپھا...

''مجھ پر جان سے فدا تھے۔ جب انہوں نے بریف کیس سے وہ منحوس کاغذ نکال کر میری طرف بڑھایا تو اُن کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ انہوں نے میرے سر کی قسم کھا کر صاف کہہ دیا تھا کہ یہ سب محض دکھاوا ہے، دوسروں کا منہ بند کرنے کے لیے، ورنہ تو ہمارا رشتہ اٹوٹ ہے، وہ اب اور ہمیشہ قائم رہے گا، اسے کوئی نہیں توڑ سکتا۔

''پھر تم جانو وہ یہ کام بے دھڑک اور بلا تردّد بھی کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے رو رو کر بڑی التجاؤں سے میری اجازت مانگی تھی۔ میری آنکھوں سے بھی اُس وقت آنسوؤں کی جگہ خون نکلا۔ میں نے ہاتھ سے پکڑ کر انہیں اُٹھایا اور کہا:

''میرے سرتاج مجھے زیادہ گناہ گار نہ بناؤ۔ مجھے سب کچھ منظور ہے۔ جیسی تمہاری خوشی ہو کرو پر اپنے قدموں سے کبھی الگ نہ کر دینا۔ وہ پھر میرے گھٹنوں پر جھک گئے اور بولے:

'میری خوشی تو تیرے پاس ہے۔ یہ سب کچھ تو مجبوری سے کر رہا ہوں اور تم جانتی ہو

میں تم سے الگ نہیں رہ سکتا۔ دلہن کا منہ دیکھے بغیر دو دن میں اُڑ کر تمہارے قدموں میں پہنچوں گا۔ یہ دلوں کے رشتے ہیں۔ انہیں ایسی اوچھی باتوں سے نہیں توڑا جا سکتا۔' پھر وہ آنسو پونچھتے چلے گئے۔ میری آنکھوں کے آگے بھی آنسوؤں کا پردہ تھا۔ پھر بھی میں اس راستے کو دیر تک دیکھتی رہی جس راستے سے وہ گئے تھے۔ راستہ کچا تھا اور سٹیشن تک پہنچنے کے لئے یکہ یا گھوڑا استعمال کیا جاتا تھا۔ اُن کی گھوڑی سفید تھی جس کی دم کالی تھی۔ وہ مجھے دور تک دکھائی دیتی رہی۔ وہ بھی برابر مڑ مڑ کر مجھے حسرت سے دیکھتے گئے۔''

''آپ بھی کیسی بھولی ہیں اور وہ کمبخت کیسے مکار نکلے۔'' کئی بار کے سُنے ہوئے اس قصے پر کوئی احتجاجاً کہہ اُٹھتا۔

''ایسا مت کہو۔'' پھوپھی دکھی آواز میں کہتیں اور ہاتھ کو بڑے اضطراب سے جنبش دیتیں۔

''کیوں نہ کہیں؟ ہم تو ضرور کہیں گے، خواہ آپ لاکھ اِس فریب کو سمجھنے سے گھبرائیں۔''

پھوپھی کا سر جھک جاتا اور ان کا رنگ یوں زرد پڑ جاتا جیسے کوئی بڑی سنگ دلی سے ان کے دل کو توڑ رہا ہو۔ وہ کچھ دیر بالکل چپ رہتیں، پھر گمبھیر آواز میں کہتیں۔

''وہ ایسے نہیں تھے، میرا دل گواہی دیتا ہے۔ اگر وہ دھوکے باز ہوتے تو میں اب تک انہیں یوں اپنے دل کے آس پاس محسوس نہ کرتی۔ تم نے اُنہیں نہیں دیکھا اس لیے ایسا قیاس کرتے ہو۔ مگر میں نے اُنہیں دیکھا اور پرکھا تھا۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں، وہ دھوکے باز نہ تھے۔ ہاں وہ حالات کے ہاتھوں مجبور ضرور ہو گئے تھے۔ ایک بار میرے دل میں بھی اُن کے خلاف وسوسے پیدا ہوئے تھے اور میں نے اسی طرح سوچا تھا جس طرح اب تم سوچتے ہو۔ یہ اُنہی دنوں کی بات ہے جب وہ دو دن کے وعدے پر رخصت ہوئے تھے اور لوٹ کر نہ آئے...

''میں دن رات اُن کے انتظار میں گھلتی رہی۔ طرح طرح کے وہم اور وسوسے میرے گرد اکٹھے ہو گئے اور مجھے پریشان کرنے لگے۔ پھر بھی میں انہیں دغا باز سمجھنے کو تیار نہ تھی۔ یہی سوچتی کہ کوئی مجبوری آ پڑی ہو گی۔ خدا معلوم کن زنجیروں میں باندھ کر بے بس کر

دیا گیا ہوگا۔ کوئی ایسی ہی افتاد آ پڑی ہوگی، ظالموں نے پر قینچ ڈالے ہوں گے۔ ورنہ تو وہ اُڑ کر مجھ تک پہنچتے۔ میرے بنا اُنہیں کیسے قرار آتا ہوگا۔ ایک ایک پل جیسا مجھ پر گراں ہوگیا ہے ویسا گراں ان پر بھی ہوا ہوگا۔ ضرور کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے ورنہ وعدہ خلافی ان کا شیوہ نہ تھا... یہ سب کچھ سوچتی اور یہ سوچیں کلیجے کو چھیدتیں اور دل کا خون کرتیں۔ کبھی سوچتی خود چل کر دیکھوں اور ظالموں کے پنجے سے چھڑا لاؤں۔ وہ اور مجھے یوں وہموں میں چھوڑ کر بے فکر ہو جائیں... ناممکن، قطعی ناممکن۔ یقیناً بے بس ہی ہوں گے۔ لیکن اپنا جانا بھی آسان نہ تھا۔ اکیلی کیسے جاتی۔ بھرا بھرا گھر کس کے بھروسے پر چھوڑتی۔ دل پر پتھر رکھے انتظار کرتی رہی۔ خالی ویران گھر، جو اُن کی موجودگی سے کیسا بھرا بھرا اور آباد نظر آیا کرتا تھا کاٹنے کو دوڑتا۔ اُن کی سو سو نشانیاں اُن کی یاد دلانے کو موجود تھیں۔ ایک ایک پل میں سینکڑوں کچوکے لگتے۔ خون کے آنسو بہاتی، لاکھ جبر کرتی مگر دل بے قابو ہو جاتا۔ ہاتھ ملتی کہ کیسے بن پڑے کہ اُن کے پاس پہنچوں۔ اِسی آہ و زاری میں مہینہ بیت گیا... ایک مہینہ جو ایک صدی بن کر گزرا...

''تبھی ایک دن سرکاری کارندہ سرکاری نوٹس لے کر آیا کہ مکان خالی کر دیا جائے۔ یہ میں کیا سُن رہی تھی، اپنی سماعت پر شبہ گزرا۔ سوچا کوئی بھیانک سپنا ہے مگر بیدار آنکھوں کو جو کچھ نظر آ رہا تھا، اُسے کیسے جھٹلا دیتی۔ معلوم ہوا صاحب کا تبادلہ ہوگیا ہے۔ مجھ پر آسمان ٹوٹ پڑا، زمین ہل گئی، کہیں سما جانے کو جگہ نہ رہی۔ دل کہتا یہ ناممکن ہے وہ مجھے یوں مجبور بنا کر ذلیل و خوار نہیں کر سکتے، مگر کھلی حقیقت سے کیسے آنکھیں بند کر لیتی۔ قسمت یوں بھی پھر جاتی ہے، یقین نہیں آتا تھا، عقل ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ نوکروں سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہ رہی۔ سب مجھ پر ہنستے محسوس ہوتے اور میں تماشہ بنی تھی۔ تب اس مرحلے پر میرے دل میں وسوسہ پیدا ہوا اور میں نے سمجھا میرے ساتھ دغا کی گئی ہے... مگر کیوں...؟ کس لیے...؟

''ذہن پر ایک جنون سا سوار ہوگیا کہ اپنے اس سوال کا جواب ضرور لوں گی۔ پانچ دن کی مہلت تھی۔ میں اگلے دن سر میں خاک ڈالے گھر کو جوں کا توں کُھلا چھوڑ کر روانہ ہوگئی۔ سیدھی لاہور اُن کی بہن کے پاس پہنچی... ہاں مکان کو اس کے قیمتی سامان سمیت کھلا چھوڑ دیا تھا۔ وہ چیزیں جو اُنہوں نے میرے آرام اور سہولت کے لیے مہیا کی تھیں، مجھے کوئی سکون کوئی

پناہ نہ دے رہی تھیں۔ وہ تو مجھے فریب اور دغا کا جال نظر آنے لگی تھیں اور میں ان سے دور بھاگ کھڑی ہوئی تھی...

''اُن کی بہن مجھے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔ غالباً میری طرف سے کسی ایسے اقدام کی اُسے توقع نہ تھی۔

''میں نے اُس کی حیرت کو بھانپا اور پوچھا:

''تم مجھے دیکھ کر حیران کیوں ہوگئی ہو۔؟ بولی! 'نہیں تو، آؤ تمہارا گھر ہے۔'

''میں نے کہا جھوٹ نہ بولو۔ میرا گھر اُجڑ گیا ہے بلکہ تم لوگوں نے اُجاڑ دیا ہے۔ اب میرا کوئی گھر نہیں۔ میں صرف ایک بار اُن سے ملنے کے لئے آئی ہوں۔ تمہارے پاؤں پڑتی ہوں، ایک بار اُن کا سامنا کروا دو۔ وہ بولی:

'فی الحال ممکن نہیں۔ اُس کا تبادلہ ہو گیا ہے اور وہ نئی بیگم کے ساتھ دوسری جگہ چلا گیا ہے۔'

''پھر میرا مایوس چہرہ دیکھ کر شاید اُسے ترس آ گیا... بولی:

'ہاں ایک صورت ہے، جس دن بھی آئے گا، تمہیں پیغام بھجوا دوں گی... پھر تم جانو اور وہ۔'

''میں احسان مند ہوئی مگر تبھی میں نے اُن کے قدموں کی آہٹ سنی اور آواز کو پہچان گئی۔ میں نے جان لیا کہ یہ عورت بھی مکر کر رہی ہے۔ چنانچہ میں نے وہیں ٹھہرے رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں بہر صورت اُن سے ملنا چاہتی تھی۔ اس وقت تک میرے دل میں اُن کے خلاف بہت سی باتیں اکٹھی ہوگئی تھیں میں اُن سے دغا کا سبب پوچھنے کو بے چین تھی...

''جب کچھ وقت اور گزر گیا تو وہ بے چین سی ہوگئی اور پہلو بدلنے لگی۔ ظاہر ہے وہ مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ مگر میں نے ٹھان لی تھی کہ بغیر ملے نہ جاؤں گی۔ آخر وہ اُٹھی اور بولی: 'میں کھانا تیار کرتی ہوں تم رات یہیں رہو گی؟'

''میں نے کہا ہاں اب اس وقت کہاں در بدر ہوتی پھروں گی۔ وہ کمرے سے باہر نکلی اور میں بھی بہانے سے باہر آ گئی اور کمروں میں جھانکنے لگی...

''ایک کمرے میں وہ پلنگ پر دراز تھے۔ میں نے بے دھڑک اندر جا کر اُن کے پاؤں

پکڑ لیے اور اپنی برستی آنکھیں اُن پر ٹکا دیں۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے اور بولے:
'تم کہاں؟'
''میں نے کچھ کہنا چاہا مگر میری ہچکی بندھ گئی اور الفاظ ساتھ چھوڑ گئے میں صرف پاؤں پکڑے روتی رہی۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا... بولے:
'زینب مجھے بے بس کر دیا گیا ہے۔ ورنہ تم جانتی ہو، تمہیں ایسی حالت میں اتنی دیر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ تم تک پہنچنے کی تدبیریں سوچتا رہا مگر کچھ بن نہ پڑا۔ تم مجھے جھوٹا اور دھوکے باز مت سمجھنا۔ میری مجبوری کا خیال کرنا۔ میرا دل گواہی دیتا تھا کہ تم میری مجبوری کو سمجھ جاؤ گی اور ایک دن خود مجھ تک آ پہنچو گی۔'
''میرے دل میں اُن کے خلاف جو سیاہی آ گئی تھی، اُن کی باتوں اور میرے آنسوؤں سے ڈھل کر صاف ہو گئی۔ نئی بیگم مائیکے میں تھیں ۔ وہ رات میں نے وہیں گزاری۔ اگلی صبح انہوں نے مجھے تسلی دلاسے سے رخصت کیا اور کہا جونہی حالات سازگار ہوں گے وہ مجھے اپنے پاس بلوالیں گے، تب تک میں اپنے گھر میں رہوں۔
''اب مجھے بھرے گھر کو یوں کھلا چھوڑ آنے پر تاسف ہوا۔ میں نے اُن سے ذکر کیا تو اُنہوں نے مجھے تسلی دی کہ کوئی چیز ضائع نہ جائے گی... وہ سب ٹھیک کر لیں گے۔''
''میں نے اُن کے ہاتھوں کو آنسوؤں سے تر کیا اور وصال کے جلد وعدے پر رخصت ہوئی۔''
یہاں پہنچ کر پھوپھی زینب کی آنکھوں کی کندنی کیفیت ماند پڑ جاتی۔ وہ دو تین ٹھنڈے سانس بھرتیں اور خلاء میں دیکھتے ہوئے عموماً خاموش ہو جاتیں، قصے کا یہ المناک حصہ اُنہیں ہمیشہ کسی پرانے زخم کی مانند ٹھیس پہنچاتا تھا۔
''پھر آپ کو انہوں نے بلایا کیوں نہیں؟'' کوئی پوچھ بیٹھتا۔ ''وہ بہت مجبور تھے۔'' اُن کے لہجے میں یقین اور بھروسے کی پختگی ہوتی۔
''یہ محض دل بہلاوا ہے۔ کیا وہ بچہ تھے۔''
پھوپھی کی نظروں میں غصہ، حقارت اور نفرت سی بھر جاتی۔
ہاں مرد اور بچے میں بہت کم فرق ہے۔ یہ عورت ہے، مکر و فریب کی پتلی جو اپنے

فریب کے جال پھیلاتی ہے، کبھی ماں اور بہن کے روپ میں اور کبھی بیوی کے بہروپ میں۔ ان کی دوسری بیوی ڈائن سے کم نہ تھی۔ اُس نے انہیں باندھ لیا تھا...وہ طلاق نامہ جو انہوں نے محض دکھاوے کے طور پر تیار کیا تھا، اُن کی کمزوری بن گیا۔''

''ایسی بھی کیا مجبوری؟ مردوں کی طرح صاف کہا ہوتا۔''

پھوپھی کا چہرہ دکھ اور تکلیف سے پھیکا پڑ جاتا۔ وہ یوں خاموش ہو جاتیں جیسے کچھ کہتے نہ بن پڑ رہی ہو مگر پھر فوراً سنبھل جاتیں۔

''مجھ سے بہتر اُنہیں کون جان سکتا ہے...کوئی نہیں...وہ بھی نہیں جو سمجھتی ہے وہ اُنہیں اپنا چکی ہے۔ میں اُن کی پہلی محبت ہوں اور وہ اتنے برسوں کے بعد بھی میرے قریب ہیں... سب سے زیادہ...اور اُن کے خیال میں ہی میرے لئے سکون و فرحت ہے۔ وہ یقیناً مجبور ہو گئے تھے اور اُن کے مجبور ہونے کا احساس مجھے اُن سے ملنے پر مجبور کرتا تھا۔ بس یہی سوچ مجھے اُن کی طرف کھینچتی تھی کہ جانے وہ میرے لئے کیسے کیسے تڑپتے ہوں گے، کیسی آسیں لگاتے ہوں گے، کیسی اُمیدیں جگاتے ہوں گے۔ وہ تو مجبور ہو گئے تھے مگر میں تو مجبور نہ تھی، کسی کی پابند نہ تھی، میں آزاد تھی اور اُن تک پہنچ سکتی تھی...

''یہ دو سال بعد کا ذکر ہے۔ مجھے معلوم ہوا وہ کراچی فلاں گاڑی سے جا رہے ہیں۔ میرا دل تڑپ سا گیا۔ وہ آئے اور مجھے معلوم نہ ہو سکا حالانکہ ان دو سالوں میں اُن کی بہن کے گھر کے میں نے سینکڑوں ہیرے پھیرے لے ڈالے تھے۔ اب بھی ایسے وقت معلوم ہوا جبکہ وہ جا رہے تھے...جانے پھر کب لوٹ کر آئیں...اس وقت کی میری بے چینی کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ کیسے کیسے دل کو سنبھالا، سمجھایا مگر سنبھلے کیسے نادان۔ بس یہی سوچ مجبور کرتی کہ ممکن ہے انہیں بھی میرا انتظار ہو۔ بھائیوں نے سمجھایا، ڈانٹا، منع کیا کہ مت جاؤ اب تمہارا اُس کا رشتہ ہر لحاظ سے ختم ہو چکا ہے۔ کیوں بے کار میں خود کو ذلیل کرتی ہو۔ مگر دلوں کے بھید کون جانے۔ میرے دل میں اُن کے لیے کشش پیدا ہوتی تھی۔ کوئی جذبہ مجھے اُن کی طرف کھینچتا تھا اور کوئی نامعلوم ہستی چپکے سے کان میں کہتی تھی:

'دیکھو، نا اُمید نہ کرنا۔ ایک بار شکل دکھا جانا۔' میں نے کسی کی نہ سُنی اور مقررہ دن برقع اوڑھ کر پلیٹ فارم پر جا پہنچی۔ بیگم صاحبہ ویٹنگ روم میں تھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر پریشان ہو

گئے۔ کوئی ایسا خوف اُن کے اعصاب پر چھایا تھا کہ حال احوال پوچھنے کا بھی خیال نہ آیا۔ نہ یہ پوچھا کہ یہ طویل عرصہ کیسے گذرا، کیا بیتی۔ صرف گھبرا کر اتنا کہا:

'تم...'

''میرے پاس آنسوؤں کے جواب کے سوا اور کیا رکھا تھا۔

''وہ مجھے دور ایک کونے میں لے گئے۔ پھر بھی مجرموں کی طرح گھبرا گھبرا کر پیچھے دیکھتے تھے۔

میں نے پوچھا:

''کب تک یوں تڑپنا ہوگا...رحم کرو۔

''اُنہوں نے ہاتھ جوڑ دیئے، بولے:

'اس وقت ان باتوں کا موقع نہیں۔ انشاء اللہ میں بہت جلد آؤں گا اور تفصیلاً بات کروں گا اور کچھ نہ کچھ طے کر کے جاؤں گا۔'

''میں نے سسک کر کہا...یہ وعدہ بھی پہلے وعدوں کی طرح ہوگا۔

''میرے شانوں کو تھپک کر بولے:

'مجھے بُرا نہ کہو۔ مجھ پر اعتبار کرو۔ ادھر میری آنکھوں میں دیکھو۔'

''میں نے دیکھا اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری تھیں میں اپنی بے حسی اور سنگ دلی پر کڑھ کر رہ گئی۔ جانے وہ دل پر کیسے کیسے جبر کئے ہوئے تھے۔ میں تھی کہ اپنے دکھوں پر ٹسوے بہانے میں مصروف تھی۔ میں نے آنسو پونچھنے کو جلدی سے آنچل بڑھایا مگر وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے، بولے:

'خدا کے لیے چلی جاؤ، اس طرف، اس راستے سے نکل جاؤ وہ باہر نکل آئی ہے۔'

''ایک جھلک میں نے بھی اس کی دیکھ لی...دبلی پتلی، پیازی ساڑھی باندھے تھی، رنگ بھی صاف تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہ دیکھ سکی، نہ دیکھنے کی خواہش تھی۔ اپنے آنسو سمیٹتی لوٹ آئی اور اُن کے اس آخری وعدے کے سہارے آج تک زندہ ہوں۔ پھر کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ اُن کا اتہ پتہ جاننے کی بہتیری کوشش کی مگر سب بے کار۔ کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ جہاں اور جب بھی کسی نے اُن کا پتہ بتایا سودائیوں کی طرح دوڑی گئی۔ مگر ناامیدی کے سوا کچھ ہاتھ

نہ آیا۔ کبھی اُن کے دکھ اور مجبوری کا خیال آتا ہے تو دل خون ہو جاتا ہے۔ اس عورت کے ہاتھوں جانے کن بُرے حالوں کو پہنچے ہوں گے۔ میں نے تو اُس کمبخت کو ایک جھلک میں پہچان لیا تھا۔ کیا ملکہ بنی ٹھاٹھ سے کھڑی تھی اور تمہارے پھوپھا کا اُس کے خیال سے دم نکلا جا رہا تھا۔ ایک میں تھی کہ پیار و محبت کے سوا کبھی دوسری بات نہ کی تھی۔ اپنے سلیقے اور سگھڑاپے سے اُن کا گھر بھر دیا تھا۔ وہ اچھی اچھی چیزیں لا کر دیتے اور میں سینت سنبھال کر رکھ دیتی۔ کبھی اوڑھ پہن کر بھی نہ دیکھا۔ سوچتی تھی اولاد ہوگی تو یہ سب چیزیں اُن کے کام آئیں گی۔ وہ اس بات پر کبھی ناراض بھی ہو جاتے مگر اُن کے ناراض ہو جانے میں کون سے لٹھ چلتے تھے۔ بس ذرا منہ اُتر گیا، اُداس ہو گئے، چندے بات نہ کی مگر زیادہ دیر مجھ سے گپ چپ رہ کر بھی اُنہیں چین نہ آتا تھا۔ تھوڑی دیر میں پھر ویسے ہی دیوانے ہو جاتے... بات بات پر نثار۔ میں دل میں اُن کی ناراضگی پر ہنسا کرتی۔ سوچتی جب کسی موقع پر سب کچھ نکال کر سامنے رکھ دوں گی تب میاں جی پھولے نہ سمائیں گے، کلیجے میں بھر کر کہیں گے اس دنیا میں ایسی دوسری عورت نہیں ہو سکتی۔

''انہوں نے مجھے اتنی محبت دی تھی کہ میں اُس کے بوجھ کے تلے خود کو دبا دبا محسوس کرتی۔ کبھی کبھی محض اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے لڑ بیٹھتی۔ مگر وہ کبھی پلٹ کر جواب نہ دیتے۔ یوں اس طرح لڑنے میں بھی خاک مزا نہ آتا۔

''دیکھنے میں وہ بڑے خوبصورت تھے۔ سمجھ لو یوسفِ ثانی تھے۔ اونچا لمبا قد، شربتی آنکھیں، کشادہ پیشانی، رنگ سرخ سفید، بال بھورے، سچ مچ کسی انگریز کا گمان گزرتا تھا۔ دیکھنے والے کہتے، وہ زینب کو کیسے پسند کرے گا۔ یہ بیاہ نہیں ہونا چاہیے۔ ایک طرف دولت دوسری طرف غربت۔ صورت شکل جیسی میری ہے، تمہارے سامنے ہے۔ میرے دل میں بھی زبردست دھڑکا تھا۔ سوچتی تھی میرے ماں باپ مجھ پر ظلم کر رہے ہیں۔ بے عزت بن کر اُن کے پاس رہی بھی تو کیا فائدہ مگر اُنہیں پا کر یہ سارے وسوسے جاتے رہے۔ اُنہوں نے شادی کے بعد مجھے پوجا۔ اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے۔ دو مامائیں خاص میرے بنانے سنوارنے کو رکھ چھوڑی تھیں۔ ایک کنگھی چوٹی کرتی، دوسری چوکی پر پاؤں دھرائے دھویا کرتی اور وہ دور بیٹھے میرے پاؤں کو تکا کرتے... کہتے:

’تمہارے یہ چھوٹے چھوٹے پیازی ایڑیوں والے پاؤں کتنے خوبصورت ہیں۔ جی چاہتا ہے بس انہیں دیکھتا رہوں۔‘ اکثر وہ انہیں ہاتھ میں لے کر ندیدوں کی طرح دیکھا کرتے۔

’’مجھے بہت شرم آتی۔ میں اپنے سر کی پٹیاں بگاڑ دیتی، آنکھوں سے کاجل کی لکیر مٹا دیتی، گہنا پاتا اتار پھینکتی اور کپڑوں کی طرف سے لاپرواہ ہو جاتی...

’’وہ جانے کیا سمجھتے اور کپڑوں، زیوروں اور سنگار پٹار کی چیزوں کے ڈھیر لگا دیتے۔ مجھے اُن کے بھولپن پر ہنسی آتی۔ معلوم ہوتا ہے اُنہیں خوبصورت چیزوں سے لگاؤ تھا۔ گھر میں طرح طرح کی مورتیاں لا کر رکھی تھیں... ننگ دھڑنگ، عجیب عجیب انداز میں ہاتھ پاؤں موڑے، کچھ کھڑی، کچھ بیٹھی... مجھے تو جانو انہیں دیکھ کر شرم آتی۔ میں اُنہیں اُٹھا کر اِدھر اُدھر کر دیتی۔ وہ کچھ نہ کہتے مگر چند دونوں بعد دوسری لے آتے۔ میں پھر اُنہیں کسی کونے میں ڈال دیتی... وہ پھر لے آتے اور کہتے:

’تم بھی مجبور ہو اور میں بھی مجبور ہوں۔‘

’’بہت سی تصویریں بھی انہوں نے شیشوں میں جڑا کر دیواروں پر لگا رکھی تھیں۔ مجھے جو تصویر پسند نہ آتی، میں اُس کا رُخ دیوار کی طرف موڑ دیتی۔ جو دس برس میں نے اُن کے ساتھ گزارے سمجھو جنت میں گزارے۔ انہوں نے کسی دیوی کی طرح مجھے اپنے گھر کے تخت پر بٹھائے رکھا، کبھی ایک لمحے کو شکایت پیدا نہ ہونے دی۔ انہیں بچے کی بھی خواہش نہ تھی مگر اُن کی کٹنی ماں نے اُنہیں مجبور کر دیا۔

’’اور جب لڑکی والوں نے کہا وہ بغیر طلاق نامہ دیکھے نکاح نہ ہونے دیں گے تو وہ بدک گئے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی پہلی محبت پر ظلم نہ ہونے دیں گے۔ مگر پھر اُن کی ماں بہنوں نے جانے کیا چلتر بازی کی کہ وہ مان گئے۔ مگر اُنہوں نے مجھے قسم کھا کر کہد یا تھا، یہ طلاق نامہ محض دکھاوا ہے ورنہ تو ہمارا رشتہ وہی رہے گا اور مجھے اُن کے الفاظ پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ وہ ہرگز نہیں بدلے... ہاں انہیں مجبور و بے بس کر دیا گیا تھا۔

’’اور میں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہوں۔ وہ اس نئی زندگی سے جس میں اُن کے لیے پابندیاں ہی پابندیاں ہیں ایک لمحے کے لیے خوش نہ رہے ہوں گے۔ اُن کے دکھ کو میں

سالوں سے اپنے دل میں محسوس کرتی ہوں۔ میں نے بارہا انہیں تصور میں شکستہ حالت میں دیکھا ہے۔ کئی بار خواب میں ملاقات ہوئی اور اُنہیں ہمیشہ اُداس اور پھٹے حالوں پایا... ہاں، دولت کی پجاری اور فیشن زدہ عورت سے محبت کہاں مل سکتی ہے...

''مرد کا دل ایسی مطلبی عورت سے کہاں مطمئن ہو سکتا ہے، جو اپنے آپ میں کھوئی ہو۔ وہ انہیں کہاں پہچان سکی ہوگی۔ وہ کیسے نازک مزاج اور محبت کے بھوکے تھے۔ میرا دل کہتا ہے یوں الگ کر دیئے جانے کے باوجود ہمارے دل کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوئے۔ وہ اُن سے کچھ نہ پا سکی ہوگی۔ کم از کم وہ نہیں جو میں نے اُن سے حاصل کر لیا تھا۔''

یہاں پہنچ کر پھوپھی زینب خاموش ہو جاتیں۔

اس خیالی مقابلے میں اس دوسری عورت کو شکست دے کر اُن کے چہرے کی طمانیت اور آنکھوں میں کندنی چمک لوٹ آتی۔ گویا ان کے سینے سے ایک بوجھ ہٹ گیا ہو۔ وہ سکون و اطمینان کے ساتھ آنکھیں موند لیتیں اور گھٹنوں کے گرد ہاتھ لپیٹے اُونگھنے لگتیں۔

ابا میاں دور بیٹھے انہیں بڑے ترحم سے دیکھتے اور ٹھنڈی سانس بھرتے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے انہوں نے یوسف میاں کو دیکھا تھا۔ الفلاح بلڈنگ کے سامنے وہ اپنی سفید مرسڈیز سے اُتر رہے تھے چار صحت مند خوبصورت بچوں اور ایک باوقار بیوی کے ساتھ۔ یوسف میاں کی صحت پہلے سے کہیں زیادہ اچھی ہوگئی تھی۔ اُن کی آنکھوں میں زندگی کی چمک اور لبوں پر حیات آفریں تبسم تھا۔ ابا میاں نے اس کا ذکر کسی سے نہیں کیا کیونکہ اُنہیں پھوپھی زینب کی محبت کو اس انجام تک پہنچانا خود بھی پسند نہیں۔ البتہ وہ پھوپھی زینب کے سُتے ہوئے بے رونق چہرے اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں کو خاموش ترحم بھری نظروں سے دیکھ کر ٹھنڈا سانس ضرور بھرتے ہیں۔

اور پھوپھی زینب قصہ دہرا کر نہایت سکون کے ساتھ بازوؤں کو یوں نرمی سے گھٹنوں کے گرد لپیٹ لیتی ہیں جیسے اب بھی کسی کا سر اُن کے گھٹنوں پر ٹِکا ہوا ہو۔

آخری بیان

خالو صمد کورٹ سے باہر آئے تو اُن کا سر جھکا ہوا اور مونچھوں کے کونے ڈھلکے ہوئے تھے۔ خالہ جس کی زبان پر ''یا وکیل'' کی تسبیح تھی، ایک دبی سی پھنکار کے ساتھ مڑی اور اپنا پنجہ غیاث کی کلائی میں گاڑھ کر بولی:

''ٹیکسی لو بیٹا، کیا دیکھ رہے ہو۔''

غیاث نے ہاتھ سے اشارہ دیا تو اسی سمت میں تیزی سے آتی ہوئی ایک ٹیکسی رُک گئی۔ خالو صمد سٹ پٹائے سے آگے جا بیٹھے اور وہ تینوں پچھلی سیٹ پر سمٹ کر بیٹھ گئے۔

ٹیکسی فوراً صاف ستھری آئینے کی مانند چمکتی سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔

خالہ لگاتار اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھی اور بار بار پونچھنے سے اُس کی آنکھیں بیر بہوٹی ہوگئی تھیں اور دوپٹے کے دونوں کونے بھیگ گئے تھے۔

''آخر اُسی کے صدقے بچے نا۔''

خالہ سے صبر نہ ہوسکا تو ٹیکسی ڈرائیور کا لحاظ کیے بغیر بڑبڑائی۔ خالو صمد جو پہلے ہی کافی صدمہ اُٹھا چکے تھے، خالہ کی اس بات پر اپنے آپ میں کچھ اور دبک گئے۔

خالہ... ہوں... ہوں... کر کے پھنکارنے لگی۔

جونہی ٹیکسی ہوٹل کے سامنے رُکی، خالہ چھلانگ لگا کر اُتری اور برقع پھڑ پھڑاتی تیزی سے چوبی زینے پر چڑھنے لگی۔ سہیلہ اور غیاث اس کے پیچھے تھے مگر خالو اوپر آنے کے بجائے سر جھکائے ہوٹل کے اندر چلے گئے۔

''آج یہ رات یہیں کاٹیں گے۔'' غیاث نے تنگ زینے پر چڑھتے ہوئے سرگوشی

کی....اور سہیلہ تاسف سے بولی:

''خالہ نے بیچارے خالو سے ایک بات بھی نہیں کی۔''

''مگر وہ صبح تڑکے ان کے نام پر کالے بکرے کا صدقہ دینے کا پکا ارادہ کر چکی ہے۔''

غیاث نے سنجیدگی سے کہا اور سہیلہ دبی آواز میں ہنس پڑی۔ جب وہ اوپر پہنچے، خالہ کھونٹی پر برقع لٹکا کر وضو کی چوکی پر بیٹھ چکی تھی۔

''میں تو اب نوافل پڑھنے لگی ہوں اور رات بھر پڑھوں گی۔ تم لوگ کھا پی کر سو رہنا۔ وہ پاپی تو نیچے ہی رہے گا۔ تم فکر نہ کرنا۔'' خالہ ہاتھوں اور کہنیوں سے پانی ٹپکاتی ان کے پاس آئی، پھر دوپٹے سے منہ پونچھتے ہوئے بولی:

''اللہ قسم وہ لڑکی فرشتہ تھی۔ اپنے آخری دولفظوں میں وہ میرا بال بال اپنے احسان میں باندھ گئی ہے۔ عمر بھر پڑھ پڑھ کر بخشوں تو بھی کافی نہیں۔ ارے میں اسے احسانوں کے طعنے دیتی تھی اب وہ آ کے دیکھے میں کیسے اُس کے ایک ہی احسان میں بے بس ہوگئی ہوں۔ میں تو کہتی ہوں ربا اگر عمر بھر میں کوئی نیکی کر سکوں تو یہ نیکی اس کے کھاتے میں ڈال دینا۔ اُس نے میری عزت، میرا سہاگ بچایا ہے اور یہ سب کچھ اس نے صرف میری خاطر کیا... ہاں میری خاطر۔'' خالہ نے بڑے دعوے سے چھاتی بجائی۔

غیاث چپ چاپ نظریں جھکائے سگریٹ پیتا رہا۔ مگر سہیلہ کی آنکھیں نم آلودہ ہو گئیں۔ خالہ نے جو کچھ کہا تھا سچ تھا۔ خالہ نے دبی سی سسکی لی اور جانماز پر کھڑی ہوگئی۔

اتنے میں سمندر خان کھانا لے کر آ گیا۔ دونوں نے مکمل خاموشی سے کھانا کھایا۔ پھر کمرے کے اندر چلے گئے۔

غیاث نے بند کھڑکیوں کو کھولا تو کمرہ کچے دھان کی خوشبو سے بھر گیا۔ غیاث دیر تک دریچے میں جھکا کھڑا رہا۔ سہیلہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ سب کچھ وہی تھا... وہی خوشبو، وہی کمرہ... مگر گل پری موجود نہ تھی۔ سہیلہ کو حال پر ماضی کا گمان گذر رہا تھا۔ مگر پچھلے سال تو وہ یہاں ہنی مون منانے آئے تھے۔ وہ دن کتنے پر لطف اور مسرور کن تھے... سہیلہ پچھلے سال کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو یاد کرنے لگی۔

اس دن اونچی ایڑھی کی جوتی کے ساتھ غیاث کے بازو کا سہارا لیے پتھروں کو کاٹ

کاٹ کر بنائی گئی بے ڈھنگی اور ناہموار سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اُس نے زندگی کو کس قدر مکمل اور بھرپور محسوس کیا تھا۔ جونہی اونچائی کی طرف جاتے ہوئے اُس کا قدم ڈول جاتا، تمکنت سے چلتے غیاث کے بازو کی گرفت اُس کے گرد مضبوط ہو جاتی اور ایک سرشاری کے عالم میں اس کے گلابی رخسار دہکنے لگتے۔ وہ اس وقت ہلکی پھلکی، ہوا کے دوش پر سوار تھی اور غیاث پُروقار انداز میں سر بلند کیے چلتا ہوا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ دزدیدہ نظروں سے اُس کو دیکھتی جا رہی تھی۔ اُن کے پیچھے اُن کا قلی سامان لیے آ رہا تھا... ایک ہولڈال ایک اٹیچی، ایک بیگ اور ایک ٹوکری جس میں خالہ کے لیے کچھ سوغاتیں تھیں۔ اچانک مزدور لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے نکل گیا۔ وہ بڑے ہموار اور بے جھجک قدم اُٹھا رہا تھا۔ دونوں سر اُٹھا کر حیرت اور دلچسپی سے اُسے دیکھنے لگے......

''تم پہلے بھی یہاں آ چکے ہو؟'' سہیلہ نے اچانک غیاث کے ماضی کے قریب تر ہو جانے کی خواہش کے ساتھ پوچھا۔

''ہاں''...

اب سیڑھیاں ختم ہو گئی تھیں اور وہ ایک بڑے بڑے پتھروں سے بھرے بے ڈھنگے مگر ہموار قطعہ زمین پر تھے...

''یہی ہے۔'' غیاث ایک چھوٹے سے ہوٹل کے سامنے رُک گیا۔

''رکھ دو بھئی۔'' اس نے مزدور سے کہا اور اُسے پیسے دینے لگا۔ ہوٹل میں اس وقت خاصی بھیڑ تھی مگر خالو صمد نے اُنہیں فوراً پہچان لیا اور اپنی مصروفیت سے سر اُٹھا کر بولے:

''تمہارا ٹیلیگرام مل گیا تھا۔''

''جی''...غیاث نے سر ہلایا۔

''جاؤ بھئی اوپر جاؤ''...خالو نے جلدی سے کہا۔ غالباً وہ سہیلہ کو بے پردہ دیکھ کر گڑبڑا گئے تھے۔

''یہ سامان؟''......

''سمندر خان یہ سامان اوپر لے جاؤ'' خالو نے آواز دی اور وہ تنگ چوبی زینے پر چڑھنے لگے۔

''جی آیانوں...تیل چوؤں''...خالہ غیاث کونظر انداز کر کے پکی پنجابنوں کی طرح اُس سے لپٹ گئی۔ خالہ کے نرم نرم سینے کے دباؤ اور حِدت کومحسوس کر کے وہ جھینپ گئی۔ ایسی گرم جوشی اور محبت تو اس کی ساس نے بھی کبھی نہیں دکھائی تھی۔ وہ اسی وقت خالہ کے اخلاص اور محبت کی قائل ہوگئی تھی۔

خالہ ان کی آمد پر بہت خوش تھی اور وہ اپنی خوشی کا اظہار بھی چاہتی تھی۔ انہیں بٹھا کر وہ دوڑی دوڑی گئی اور چوبی زینے میں منہ ڈال کر سمندر خان کوآواز دی:

''جلدی چائے لاؤ لڑکے۔''

پھر وہ خوشی سے بوکھلائی ہوئی اُن کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ خالہ نے لمبے چوڑے افسانے چھیڑ دیے تھے۔ اگلی پچھلی باتیں دہرا رہی تھی۔ اچانک باتوں کے بہاؤ میں پل بھر کو رُک کر بولی:

''یہ کمرہ میں نے تمہارے لیے ٹھیک کروا دیا ہے۔ اِسے گل پری نے صاف کیا ہے اور دیکھو گویا پہاڑ دھکیلا ہے۔ وہیں ڈھیر ہوگئی ہے۔''

دونوں نے کرسیوں کو ذرا جھکا کر کمرے کے اندر جھانکا...کوئی میلا سا دوپٹہ لپیٹے فرش پر لیٹا تھا۔

''پگلی ہے۔'' خالہ نے افسوس سے کہا۔

''تمہیں تو یاد ہوگی۔''

''ہاں خالہ مگر تب یہ پگلی تو نہیں تھی۔'' غیاث نے سوچ کر جواب دیا۔

''ہاں بیٹا تب یہ ٹھیک تھی۔''

پھر سہیلہ کی طرف دیکھ کر بولی:

''جب میں یہاں آ کر رہی تو یہ چھ برس کی تھی۔ پھر یہ میرے پاس ہی پلی بڑھی دوسال ہوئے، میں نے اُس کی شادی کر دی تھی۔ اُس کی برادری کا لڑکا تھا۔ مگر شادی کے ایک ماہ کے اندر اسے مالیخولیا ہوگیا۔ تب سے میرے پاس ہے۔ بڑی بُری حالت ہوگئی تھی اس بے چاری کی... کپڑے پھاڑ دیتی تھی اور گالیاں بکتی تھی۔ مگر اب یہ پہلے سے بہتر ہے۔ کیوں بیٹا یہ کبھی ٹھیک بھی ہو جائے گی؟''

غیاث نے ٹانگ پر ٹانگ دھرے اطمینان سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ پھر طویل کش لے کر بولا:

''بغیر علاج کے کیسے ممکن ہے...؟''

خالہ نے نہایت توجہ سے بات سنی۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی معصومیت اور اخلاص کو دیکھ کر سہیلہ کو یہ جواب بڑا دل شکن لگا۔ خاص کر وہ خالہ کے بے غرض جذبے سے بہت متاثر ہو چکی تھی۔ خالہ کے مایوس دل کو سکون پہنچانے کی خاطر اُس نے فوراً کہا:

''خالہ میرا تو خیال ہے یہ ضرور ٹھیک ہو جائے گی۔ آخر اب تک کچھ فرق پڑا ہی ہوگا۔''

''ہاں بیٹا...'' خالہ نے ذرا توقف سے کہا۔ بات کرتے ہوئے خالہ نے میز پوش کے کونے کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ چہرے سے مایوسی اور دُکھ ٹپک رہا تھا۔

''مگر بیٹی اس کی قیمت اس بچی کو بھاری ادا کرنا پڑتی ہے۔''

''کیا مطلب؟''... دونوں نے سر اُٹھا کر حیرت سے خالہ کی طرف دیکھا۔ خالہ کچھ سٹ پٹا سی گئی۔ اتنے میں سمندر خان چائے لے کر آ گیا۔ سہیلہ چائے بنانے لگی۔

لال آٹے کی ڈبل روٹی، مٹھائی اور کوئی دو درجن اُبلے ہوئے انڈے تھے۔

''یہاں انڈہ اور مرغ بہت سستا ہے۔'' خالہ نے انڈوں کی مضحکہ خیز تعداد کے بارے میں کچھ کہنا ضروری سمجھا۔

''باقی اناج مہنگا ہے۔''

''غربت بھی بہت ہے''...غیاث نے اَدھ جلے سگریٹ کو راکھ دانی میں پھینک کر کہا۔

پھر چائے کا پیالہ پکڑتے ہوئے بولا:

''خالہ بات اَدھوری رہ گئی۔''

خالہ نے سر پر ہاتھ مارا اور دکھ سے بولی:

''تم اپنے خالو کی طبیعت سے واقف ہو۔ وہ بڑا جابر اور سخت مزاج آدمی ہے۔ اس کے ساتھ نبھانے کی خاطر میں اپنے دل و دماغ کو برف بنا چکی ہوں۔''

''مگر خالہ یہ تو آپ کی پسند کی شادی تھی اور اسی لیے آپ کو شہر بدر بھی ہونا پڑا تھا۔'' غیاث نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔

''ہاں بیٹا''... خالہ کھسیانے پن سے ہنسی۔

''مگر میں طبیعت کی بات کر رہی ہوں۔ تمہارا خالو اس لڑکی کو اس حالت میں گھر میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ مگر میں نے اسے چھوٹے سے بڑا کیا تھا۔ پھر اس کے ماں باپ یا کوئی بہن بھائی بھی نہیں تھا۔ میں اسے یوں بے یار و مددگار دھکا دینے کو تیار نہ تھی۔ جب اسے دورہ پڑتا، تمہارا خالو طیش میں آ جاتا۔ پہلے پہل تو وہ ہونٹ کاٹتا نیچے اُتر جاتا اور رات بھر وہیں رہتا۔ مگر ایک رات وہ آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے آتش دان سے جلتی لکڑی نکال کر اسے کھینچ ماری۔''

''اوہ...!'' غیاث نے بے چینی سے پہلو بدلا اور سہیلہ نے چائے کا پیالہ یوں تیزی سے میز پر رکھا، جیسے گرم چائے نے اُس کا حلق جلا دیا ہو۔

''جس جگہ لکڑی پڑی، اس جگہ اُسی وقت چربی نکل آئی۔ میرا خیال تھا گل پری طوفان مچا دے گی مگر اُسے تو جیسے سانپ سُونگھ گیا۔ کوئی جری سے جری آدمی بھی اس تکلیف کو اُف کیے بغیر نہیں سہہ سکتا تھا۔ مگر اُس نے یہ سب کر دکھایا۔ میں حیران بھی تھی اور رو بھی رہی تھی۔ تمہارے خالو منہ سر لپیٹ کر سو گئے تھے۔ میں نے دوا تیار کی مگر وہ ہاتھ نہ لگانے دیتی تھی۔ بلکہ اُلٹا مجھے نوچنے لگی... بولی:

''تم کون ہو بیچ میں آنے والی۔''

اُس نے میرا دوپٹہ نوچ پھینکا اور میرا گریبان ہاتھوں میں پکڑ لیا، پر میں نے بُرا نہیں مانا۔ اس لڑکی نے مجھے بہت سکھ دیے ہیں اور یہ باتیں اُس کے اختیار میں نہ تھیں۔ اس واقعہ کے بعد تمہارے خالو کا ایسا ہاتھ کھلا ہے کہ ذرا سی حرکت پر بُری طرح پیٹنے لگتے ہیں۔ اُسے پٹتے دیکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ پھر یہ فکر بھی رہتی ہے کہ کہیں چوٹ آ گئی تو اُلٹی ہتھ کڑی لگ جائے گی۔ مگر اتنا ہے کہ اب یہ پہلے سے بہتر ہے۔ دورے کم پڑتے ہیں اور ان کی شدت بھی کم ہوتی ہے۔ دنوں سکون اور خاموشی رہتی ہے۔ اب تو گھر کا چھوٹا موٹا کام بھی کرنے لگی ہے۔''

’’مگر یہ کوئی علاج تو نہیں ہے‘‘...سہیلہ نے زبردست احتجاجی لہجے میں کہا۔
’’یوں تو اُس کا ذہن کچھ اور بھی اُلجھ کر رہ جائے گا‘‘ .... سہیلہ نے تائید چاہی مگر غیاث چپ چاپ بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔
جو کمرہ خالہ نے انہیں دیا تھا، یہ وہی تھا جہاں پچھلی طرف سے کھیتوں سے دھان کی خوشبو ہر وقت اُٹھتی رہتی اور ان کے دماغوں کو معطر کرتی رہتی۔ رات کو دونوں سونے کے لیے گئے تو سہیلہ نے کہا:
’’غیاث تمہارے خالو تو مجھے جاہل آدمی معلوم پڑتے ہیں۔ ایک کمزور اور بیمار عورت پر ہاتھ اُٹھاتے اُنہیں شرم نہ آتی ہوگی۔‘‘
غیاث دھیرے سے ہنس پڑا تھا:
’’ہے تو بُری بات مگر میرے خیال سے گل پری یوں نہیں، کچھ اور طرح سوچتی ہے۔‘‘
’’کیوں...؟‘‘ سہیلہ نے بے اعتباری سے کہا۔
غیاث کروٹ کے بل لیٹ گیا۔
’’جذبات کی دنیا بھی عجیب شے ہے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا...‘‘ سہیلہ کو خاموش دیکھ کر وہ ہلکے سے ہنسا۔
’’اور خالہ بے چاری کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ وہ ٹھیک ہو رہی ہے۔ اب تو وہ بے چاری ایسی گتھی بنتی جا رہی ہے جس کا الجھا سرا ڈھونڈنا اتنا آسان نہیں رہا۔‘‘
’’اُسے پاگل نہیں کہا جا سکتا۔‘‘ سہیلہ نے کہا۔
’’ہاں اسی لیے میں نے اُسے گتھی کہا ہے۔‘‘ غیاث نے جواب دیا۔
’’میرے خیال میں وہ زبردست ذہنی اُلجھن کا شکار ہے۔ اوپر سے خالو کی مار پٹائی نے اُسے وحشت زدہ کر دیا ہے۔ تم نے اُس کا چہرہ دیکھا ہے۔ پھٹی پھٹی خوفزدہ آنکھیں، شکنوں سے بھری، کھردری اور بے رونق جلد اور چہرے پر غیر انسانی سی کرختگی اور کھچاؤ۔ ایک نظر میں اس کے چہرے کا تاثر بالکل غیر فطری اور غیر انسانی ہوتا ہے۔‘‘
’’یہ بالکل صحیح ہے مگر ذہنی طور پر وہ اتنی حساس نہیں جتنا تم سمجھتی ہو۔‘‘
’’کسی نفسیاتی معالج سے مشورہ کرنا چاہیے۔‘‘ سہیلہ نے کہا اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔

صبح سہیلہ دیر سے اُٹھی۔ پھر کسلمندی کا بہانہ کر کے بستر پر دراز رہی۔ دراصل وہ خالو جیسے قابلِ نفرت شخص کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ لیٹے لیٹے کھلی کھڑکی سے آنے والے خوشبودار جھونکوں میں لمبے لمبے سانس لیتی رہی۔ اتنے میں دروازہ ہلکی سی آہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ اُس نے نظریں گھما کر دیکھا اور جھری میں گل پری کا چہرہ دیکھ کر اُسے استعجاب بھری مسرت ہوئی۔ اُس نے اشارے سے اُسے اندر آنے کی دعوت دی۔ اُسے یقین نہ تھا کہ گل پری اندر آ جائے گی۔ مگر گل پری فوراً اپنے پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کرتی اندر آ گئی اور بلا تکلف و بلا اجازت اُس کے سفید براق سے بستر پر بیٹھ گئی۔ سہیلہ کسی قدر سٹ پٹائی نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ قریب سے دیکھنے پر وہ خاصی غلیظ نظر آ رہی تھی۔ اُس کے ناخن ٹیڑھے میڑھے اور گندے تھے۔ اُس کا جسم اور کپڑے میلے اور بدبودار تھے۔ سر کے بال چکٹ اور غور سے دیکھنے پر ان پر جوئیں رینگتی نظر آ سکتی تھیں۔ شاید وہ کسی وقت خوبصورت رہی ہو مگر دو سال سے جسمانی اور ذہنی اذیت اُٹھاتے رہنے کے بعد وہ اپنا حُسن کھو چکی تھی۔ اب تو وہ کسی ایسے پودے کے کی مانند نظر آ رہی تھی جسے ایک جگہ سے اُکھیڑ کر دوسری جگہ لگا دیا گیا ہو اور جو نئی مٹی میں جڑیں پکڑنے سے پہلے سوکھا اور بے برگ و بار نظر آتا ہے۔

ایک عجیب کراہت محسوس کر کے سہیلہ تھوڑا سا پیچھے کو کھسک گئی۔

''کیا یہ کبھی ٹھیک ہو سکے گی؟''......

''شاید کبھی نہیں''......اُس نے مایوسی سے سوچا۔

گل پری مسلسل پیلے پیلے دانت نکالے ہنس رہی تھی۔ سہیلہ نے اُس سے بات کرنے کی کوشش کی۔ دراصل وہ خالو کے بارے میں اس کے تاثرات معلوم کرنا چاہتی تھی۔ گل پری ہنس ہنس کر کچھ کہتی رہی مگر اُس کے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی اس کی سمجھ میں نہ آ سکا۔

اچانک گل پری اُٹھی اور ہی ہی کرتی باہر نکل گئی۔ سہیلہ نے اطمینان و سکون کا سانس لیا۔

افوہ! کیسا ہونقوں کا سا چہرہ تھا۔ اس لڑکی میں یقیناً سب جذبے مر چکے ہیں۔ یہ نہ نفرت کر سکتی ہے، نہ محبت اور خالو بے چارے واقعی قابلِ رحم ہیں۔

جب وہ باہر آئی، خالو نیچے جا چکے تھے۔ غیاث دیوان پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔ دانت

صاف کر کے اور آنکھوں پر پانی کے چند چھینٹے مار کر وہ غیاث کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

''تمہارے خالو ابھی ناشتہ بھجوا دیتے ہیں۔'' خالہ نے نہایت محبت سے کہا۔

''یہاں تو بھوک بھی بہت لگنے لگی ہے۔'' سہیلہ نے ذرا دور زمین پر پھسکڑ امار کر بیٹھی ہوئی گل پری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

خالہ اس بات پر نہال سی ہو گئی۔ وہ لپک کر زینے کی طرف گئی اور سمندر خان کو آواز دی۔ خالہ کی اس محبت پر سہیلہ کو بہت پیار آیا۔ جب خالہ لوٹ کر آئی تو اُس نے کہا:

''خالہ! گل پری کبھی نہاتی دھوتی نہیں۔''

''نہاتی ہے جب چھڑیاں برستی ہیں۔ دس چھڑیاں گن کر کھاتی ہے پھر نہاتی ہے۔'' خالہ کے لہجے میں غصہ تھا۔

غیاث زور سے ہنس پڑا۔ پھر سہیلہ سے مخاطب ہو کر بولا:

''ابھی دونوں میں بڑی پُر لطف لڑائی ہو رہی تھی۔''

خالہ خفیف سا مسکرائی مگر غصیلہ لہجہ برقرار رکھتے ہوئے بولی:

''بڑی گھُنی ہے۔ سو احسان کیے ہیں، پر سوکنوں کی طرح لڑتی ہے میرے ساتھ...''

''مگر کس بات پر؟'' اس نئے انکشاف پر سہیلہ کو بڑی حیرت ہوئی۔

خالہ نے ہلکے سے آنکھ ماری:

یہی جانے! میری سمجھ میں تو اس کی کوئی بات نہیں آتی۔ پر بابا مجھے اس سے ڈر ضرور آتا ہے۔ کسی دن میرا یا تمہارے خالو کا گلا نہ گھونٹ دے۔ کمبخت جنونی آدمی کے اندر کوئی دوسری طاقت ہی ہوتی ہے۔''

سہیلہ کی نظریں گل پری پر جمی تھیں جس کے چہرے کے ناگوار تاثرات کو بھانپ کر اُسے حیرت ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے خالہ کی باتیں اُسے اچھی نہیں لگ رہی تھیں اور وہ ماتھے پر بے شمار شکنیں ڈالے اور آنکھیں سکیڑے کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

''بد دعائیں دے رہی ہے۔'' خالہ نے کھسیانے پن سے کہا۔ مگر اس کے لہجے میں اب غصے کی جگہ ممتا اور پیار جھلک رہا تھا۔

مرتے وقت بھی گل پری کے چہرے کا تاثر ایسا ہی تھا... غصے اور نفرت سے بھرا ہوا۔

اچانک سہیلہ کو یاد آیا اور اُسے کچھ حیرت سی ہوئی۔ غیاث کھڑکی سے ہٹ آیا تھا۔ اب وہ پلنگ پر دراز چھت کو گھورتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔

اس دن جب خالہ کا ٹیلیگرام ملا تو دونوں پریشان ہو گئے تھے۔ خالہ بیچاری کا ان کے سوا اور کون اس دنیا میں تھا۔ غیاث نے ٹائم ٹیبل دیکھا اور رات کی گاڑی پر سوار ہو گئے۔ دونوں خاموش اور فکر مند تھے۔ ابھی تک ان کے درمیان اس معاملے پر بات نہ ہوئی تھی۔ کوئی ایسا خوف تھا جو ان کی زبان بند کیے ہوئے تھا۔ آخر سہیلہ نے بہت حوصلے سے کام لے کر کہا تھا:

''خدا کرے خالو خیریت سے ہوں۔''

''تمہارا خیال ہے خالو صمد کو کوئی نقصان پہنچا ہے؟'' غیاث نے سگریٹ کے دھوئیں میں کچھ دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں'' سہیلہ بولی۔

''میرے خیال میں ایسا کچھ نہیں ہوا'' پھر وہ چپ ہو گئے۔

جب وہ وہاں پہنچے تو خالو صمد کو ایک روز پیشتر گل پری کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کیا جا چکا تھا۔ خالہ نے انہیں چپکے سے سب کچھ بتا دیا تھا۔ خالو نے اُسے کپڑے دھونے کا ڈنڈا مارا تھا جو مہلک ثابت ہوا۔ مگر انہوں نے بیان میں یہی کہا تھا کہ وہ گر پڑی تھی۔

''خدا کے لیے کچھ کرو۔ اُس منحوس کے لیے میں اپنا گھر اُجاڑ بیٹھی ہوں۔ نہ وہ بد بخت میرے گھر میں ہوتی، نہ یہ دن دیکھنا پڑتا۔'' خالہ باؤلی ہوئی جا رہی تھی۔ گل پری ہسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔

وہ دونوں اُسے دیکھنے ہسپتال گئے تو وہ جان کنی کی اذیت میں تھی۔ وہ دو دن سے بے ہوش تھی اور اُس کے ہوش میں آنے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ پھر بھی تھانیدار اُس کا آخری بیان قلم بند کرنے کو وہاں بیٹھا تھا۔

موت سے کچھ دیر پہلے اُس نے اچانک آنکھیں کھول دیں تو سبھی کو اَز حد حیرت ہوئی۔ تھانیدار فوراً اُس پر جھک کر بے صبری سے بولا:

''گل پری تمہیں صمد خان نے مارا ہے۔''

گل پری کی بجھی بجھی ۔ بے جان نظریں جو غیر متحکم اور بے معنی انداز میں چیزوں پر

پھسل رہی تھیں، اچانک تھانیدار کے چہرے پر جم گئیں اور ان میں راکھ میں دبی چنگاری کی سی چمک نظر آنے لگی۔ اُس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''ہاں... ہاں... کہو کیا کہنا ہے۔''

تھانیدار نے بے صبری سے اُسے حوصلہ دیا۔

''تمہیں صمد خان نے مارا ہے۔''

یک بارگی جیسے اُس نے اپنی کھوئی ہوئی پوری طاقت کو جمع کر لیا ہو۔ اُس نے بڑے زور سے دائیں بائیں نفی میں سر ہلایا اور اس کے ساتھ ہی اُس کے حلق سے خرخراتی سی آواز نکلی:

''نہیں.... نہیں...''

پھر تھانیدار نے مایوس ہو کر اپنے کان اور قریب کر لیے۔

''ہاں پھر کس نے مارا ہے۔''

تب گل پری کے چہرے پر وہی مخصوص ناگوار سا تاثر پھیل گیا، جیسا خالہ سے لڑتے وقت ہوتا تھا۔ ماتھے پر شکنیں ڈالے اور آنکھوں کو سکیڑ کر وہ غیر واضح انداز میں بڑبڑائی۔ غیاث اس کے بائیں ہاتھ جھکا کھڑا تھا۔ اچانک وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ سہیلہ نے محسوس کیا کہ وہ کانپ رہا تھا اور اُس کی پیشانی پسینے میں بھیگ گئی تھی۔

وہ گل پری کے بیان سے پریشان کیوں ہوا تھا؟ سہیلہ کو تعجب ہو رہا تھا۔

تھانیدار اسی طرح جھکا کھڑا گل پری کی بڑبڑاہٹ کو سمجھنے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا مگر اچانک اُس کی موت واقع ہو گئی اور یوں دو لفظوں میں بیان مکمل ہو گیا۔ خالو کو شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا گیا۔

اچانک سہیلہ نے مڑ کر غیاث کی طرف دیکھا۔

''گل پری کے بیان سے تم پریشان کیوں ہو گئے تھے؟'' اُس نے پوچھا۔

غیاث نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور کچھ دیر ٹھٹھکی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔

''کیا تم نے ایسا محسوس کیا تھا؟''

''ہاں''....

غیاث نے ٹھنڈا سانس بھرا پھر تھوڑے توقف سے بولا:

''میں اس وقت سے دکھی ہوں ۔ کیا تم نے وہ بیان سنا تھا؟''
''سب نے سنا تھا''.... سہیلہ نے کہا۔
''نہیں وہ بیان کسی نے نہیں سنا۔ اگر سُنا بھی تو سمجھا نہیں۔ مگر میں اُس کی مخصوص بڑبڑاہٹ کو سمجھ گیا تھا''
''کیا سمجھ گئے تھے؟''.... سہیلہ نے تعجب سے پوچھا۔
غیاث نے کھلے دروازے سے باہر دیکھا۔ پھر اُس کی نظریں تخت پوش کے ایک کونے پر جم گئیں جہاں خالہ کا دوپٹہ پھیلا ہوا تھا... خالہ سر بسجود تھی۔
''کیا سمجھ گئے تھے؟''...... سہیلہ نے اضطراب سے پوچھا۔
''گُل پری نے اپنے آخری بیان میں الزام خالہ پر لگایا تھا۔''
غیاث سوچ بھری نظروں سے مسلسل باہر دیکھ رہا تھا...

زندہ درگور

یہ ایک گنبد تھا۔

جسے انہوں نے خود اپنے گرد تعمیر کیا تھا۔

اس گنبد میں نہ باہر جانے کا راستہ تھا، نہ اندر آنے کا۔

اس گنبد کی دیواریں بہت اونچی اور کالی تھیں اور ان کے تہ در تہ سناٹوں میں آوازوں کا ہجوم تھا۔ سالوں پرانی گم شدہ آوازوں کی بازگشت جو کسی کو سنائی نہیں دیتی تھی اور وہ سب وہاں تھے... ایک لمبے انتظار کے کرب میں مبتلا۔

اُن کی آنکھوں کے سامنے دیواریں تھیں۔ خالی ہاتھ خلا میں معلق تھے اور پاؤں گنبد کی تاریک راہداریوں میں چلتے تھے اور انہیں اپنے قدموں کی چاپ ان بے آواز خلاؤں میں سنائی دیتی تھی اور وہ سمت اور وقت کا اندازہ لگاتے تھے۔ گنبد میں وقت کی برق رفتار سوئیاں انہیں کالی دیوار پر ساکت نظر آتیں اور گھڑیال ایک قرن بعد گھنٹہ بجاتا اور وہ گاڑھے اندھیرے میں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے مگر سوال نہیں کرتے تھے۔ ان کے درمیان کوئی بھید تھا اور وہ شک میں مبتلا تھے اور کن سوئیاں لیتے تھے۔

کالے پتھروں سے باہر کوئی تھا۔ انہوں نے کئی بار محسوس کیا تھا اور اس شک و شبہے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے وہ ہمہ تن گوش ہو جاتے...... اور دیواریں سنتیں...... کوئی ہے..... ہاں کوئی ہے...... ضرور کوئی ہے...... وہ سرگوشیاں کرتے اور ان کی سرگوشیاں پلٹ کر آتی سنائی دیتیں:

''کوئی..... ہے..... ہے..... ہے'' اور وہ بے رحم سرد نظروں سے ایک دوسرے کے

آر پار دیکھتے اور دم سادھے انتظار کرتے۔

''کوئی ہے...'' سناٹے بولتے چلے جاتے۔

وہ آگے چلتے اور ان کی مضطرب بے کل نظریں پیچھے دیکھتیں۔

گزرتے وقت کی سرسراہٹ انہیں محسوس ہوتی۔ خوف اور وحشت سے وہ دیوار کے آگے ایک اور دیوار بناتے اور ہر درز میں اپنی ہی انگلیاں کاٹ کر ٹھونس دیتے اور دیواروں سے باہر حبشی غلام تلواریں سونت کر کھڑے ہو جاتے۔

اتنی ہوشیاری اور چوکسی کے باوجود ایک حقیر چیونٹی جب گنبد میں داخل ہوئی تو کسی کو دکھائی نہیں دی اور وہ ہاتھی کے بھاری قدموں تلے آنے سے صاف بچ کر اُس کی سونڈ میں چڑھ گئی اور وہ ہاتھی چت ہو گیا۔ یہ ایک اَن ہونی تھی جو انہیں قبول نہیں تھی۔ انہوں نے ہاتھی کو اُٹھا کر باہر پھینک دیا۔

اب وہ ان میں سے نہیں تھا۔ کیونکہ ان کے بیچ میں گنبد کی دیوار اور شک وشبہ کے سائے تھے۔ ان کی آنکھوں میں دکھ اور اداسی تھی اور بے یقینی تھی۔

کتنے قرنوں کے گھنٹے بجے اور کتنا سماں بیت گیا...... وقت کی سوئیاں کالی اونچی دیوار پر لرزتی رہتیں اور ان کے سارے دیکھے اَن دیکھے خواب اُن کے اپنے ہی پاؤں تلے آ کر چکنا چور ہو گئے۔ ان کے تھکے قدم چلتے میں لرزاں تھے اور دائرے میں چلتے تھے اور اس دائرے کا کوئی سرا نہیں تھا... کھینچو اور کھینچتے چلے جاؤ... انتظار کرو اور کرتے جاؤ۔

مگر کب تک.....؟ کسی گہرے راز کی طرح یہ سوال گنبد کے اندر ہی اندر گردش کرتا اور ایک قرن بعد جواب ملتا۔

''انتظار! مگر کس کا؟''

پھر یہ سوال گنبد کی بند راہداریوں میں ایک چیخ بن جاتا اور پلٹ کر ان کے کانوں میں گونجتا۔

کتنا اذیت ناک عمل تھا۔

ڈر کر انہوں نے اشاروں میں باتیں کرنا سیکھ لیا تھا اور دیواروں سے باہر تو حبشی غلام موجود تھے۔

پھر یہ شاید نیت کا فتور تھا کہ پتھر کی دیواروں سے ریت گرتی تھی۔
اور دیواروں کے پیچھے بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دیتی تھی۔
کہیں نہ کہیں گڑ بڑ ضرور تھی۔
اس اندیشے نے ان کے جسم نڈھال اور ذہن پراگندہ کر دیئے تھے۔ وہ تیز چلتی نبضوں کے ساتھ سنتے۔
کیا حبشی غلام سو گئے تھے؟؟
یہ دستک کس نے دی.........؟؟
کوئی ہے.......؟ وہ آواز دیتے
مگر کون.........؟؟
حیرت سے اُن کی آنکھیں پھٹ جاتیں اور منہ کھل جاتے۔ وہ ایڑیاں اُچکاتے اور سیدھی لمبی دیوار پر ان کی آنکھیں پتھرا جاتیں۔
کوئی نہیں.......کوئی نہیں...
اُن کی ہمت پست ہو جاتی، اُن کے چہروں پر بال جھول جاتے، چاندی چمکتی اور ہسٹریائی چیخیں اُن کے خشک گلوں میں کہیں گُم ہو جاتیں اور اُن کے منہ کھلے رہ جاتے۔
تب سفید دنوں کو دیکھنے اور نئی آوازوں کو سننے کی پیاس اُن کے دلوں میں بھڑک اُٹھتی اور وہ بے بسی اور لاچاری سے تہہ در تہہ دیواروں میں سوراخ ڈھونڈتے اور روزنوں کو تلاش کرنے میں سر پٹختے۔
بس مردوں سے بھری ہے اور وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہے۔ سامنے آئینے میں پیچھے بیٹھے مردوں کی قطاریں نظر آ رہی ہیں۔ وہ اپنا سفید مخروطی ہاتھ (خوش فہمی) کھڑکی کے شیشے پر رکھ دیتی ہے.......وہ کتنی خوبصورت ہے؟؟
(آئینہ مت دیکھنا)
وہ چادر میں لپٹے لپٹے کسمساتی ہے جیسے کوئی بھاری ہاتھ اُس کے ہاتھ پر ہو۔ پیچھے سے کچھ آنکھیں اُس کو ٹٹولتی ہیں۔ وہ بُرا نہیں مانتی، وہ مسکراتی ہے، بس سے اُترتی ہے اور سڑک پر لہرا کر چلتی ہے... کتنی لچک ہے اُس میں... وہ چل نہیں رہی، ہوا میں تیر رہی ہے، اُڑ رہی ہے،

جیسے کوئی ابابیل ہَوا میں پنکھ کھولے ہولے ہولے تیرے...ہلکی پھلکی سچ مچ ابابیل۔ وہ بھرے بازار میں لہراتی ہوئی گزرتی ہے...اپنے آپ میں سمائے صرف خود کو محسوس کرتی......اور کوئی نہیں صرف وہی وہ ہے۔ بازار جسموں سے بھرا ہے...گرم دھڑکتا گوشت...کیسی بساند ہے۔ وہ اپنی اکائی کو روکتی ہے۔ ایک بالوں بھرا گیلا بازو اُس کو چھو گیا ہے۔

تم نے مجھے چُھوا......؟ مجھے....؟ وہ اچانک چلانے لگتی ہے۔

''بے شرم''.....

''جی وہ.....''

''چپ کمینے ذلیل مجھے چُھوا......؟ مجھے؟''

''جی وہ.......معاف کر دیں......''

''شٹ اَپ۔ دور ہو جاؤ یہاں سے......ورنہ۔''

ہاں ورنہ کیا؟؟

''بھاگ گیا......'' (بھیگی بلی)

یہ بھیگے چوہوں جیسے مرد بھی کیسے ہوتے ہیں.....ترس آتا ہے (ہنسی)۔ بزدل، ڈرپوک۔

وہ خود کو بیمار محسوس کرتی ہے۔ شاید بہت بیمار ہے یا شاید نہیں......سب گڈمڈ ہے۔

''ڈاکٹر صاحب مجھے دیکھئے میں آپ کی پرانی مریضہ ہوں۔ سب کو چھوڑیئے اور میری طرف دیکھئے۔ مجھے ایک مدت سے بخار آ رہا ہے۔ آپ کی دوا کیسی ہے، کچھ اثر نہیں ہوتا۔ مجھے روز یہاں آنا پڑتا ہے (لوگ کیا سوچیں گے)

''ویسے بائی دی وے آپ کی عمر کتنی ہے؟ ارے بس (ہنسی)۔ اچھا یہ بتایئے میں آپ کو کیسی لگتی ہوں۔ بالکل سچ بتائیں (کیا تم سچ قبول کر لوگی)۔ آپ تو بہت اچھے ہیں۔ آپ کی دوا بھی اچھی ہے۔ میں ٹھیک ہو جاتی ہوں مگر پھر بیمار ہو جاتی ہوں۔ کچھ کیجئے ڈاکٹر صاحب۔ ان سب مریضوں کو باہر نکال دیجئے۔ آپ کا چہرہ کتنا بچگانہ سا ہے۔ مجھے ایسے کچے کچے چہرے بہت اچھے لگتے ہیں...کچی کیریوں جیسے......(ہنسی)۔ میں بڑی بے تکلف ہوں آپ نے بُرا تو نہیں مانا۔

''جی.....جی...''

''ڈاکٹر صاحب آخر میری نبض کیوں نہیں دیکھتے۔ بس منہ میں تھرمامیٹر ڈال دیتے ہیں۔ اس سے خاک پتہ چلتا ہے کہ بیماری کیا ہے؟؟ اچھا تو میں چلتی ہوں.....نہیں اب نہیں رکوں گی۔''

''توبہ ہے ڈاکٹر صاحب...... آپ بڑے وہ ہیں...... یہ آدمی جو دروازے میں کنسوئیاں لے رہا ہے وہ کون ہے......اچھا تو یہ آپ کا کمپاؤنڈر ہے؟ یہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ کل اس نے مجھے لفٹ دی اور جہاں میں نے کہا وہیں اتار دیا.....اسے آپ نکال دیں.......

''ڈاکٹر صاحب.....کل رات میں نے آپ کو خواب میں دیکھا جیسے آپ میرے بیڈ پر بیٹھے ہیں... بالکل میرے پاس اور میری نبض دیکھ رہے ہیں۔ (فرائڈ کو بیچ میں نہ لائیں) ماں بھی پاس کھڑی ہے۔ میری ماں نے میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں..... خیر جانے دیں.....خوابوں کا کیا بھروسہ...... ماں کہتی ہے اس خواب کی تعبیر.....خیر جانے دیجئے۔

''اچھا میں چلتی ہوں......چھوڑیں نا میرا بازو''

وہ لہرا کر باہر نکلتی ہے۔

دستک...کوئی ہے.....؟ کون ہے.....؟... پرانی بوسیدہ آوازیں۔

حبشی غلاموتلواریں سونت لو۔ الارم لگا دو، کہیں غلاموں کو نیند نہ آجائے۔

وہ کتنی بھاری بھرکم ہے۔ وہ چلتی ہے تو گویا سارا جہان ساتھ لے کر چلتی ہے... کتنی بھرپور اور باقی ساری دنیا کتنی ہلکی اور بے وزن ہے۔ وہ کرسی پر پھیل کر بیٹھتی ہے اور میز پر ہاتھ پھیلا کر رکھتی ہے (اپنے چھوٹے ہونے کا خوف)۔ بات کرتی ہے تو بلند اور ہر سُو چھا جانے والی آواز میں۔ نکمی ہڈ حرام اُستانیاں... آم کی چچوڑی گٹھلیوں جیسی۔ وہ سب کو اپنے سے نیچے دھنسا دینا چاہتی ہے (خالی پن کا خوف)..... پارے کی طرح تھرکتی چنچل چلبلی بے شرم طالبات......ایک دن وہ ان سب کو درست کر دے گی۔

اُس کی میز پر رنگین خوشبو دار لفافہ پھڑ پھڑا رہا ہے۔ ہلکی مہک اُس کے کہیں آس پاس ہے۔لڑکی کے جسم کی بوٹی بوٹی کانپ رہی ہے۔ عینک ناک کی پھننگ پر کھسکا کر وہ اس کی اور دیکھتی ہے۔ آنکھوں میں سفاکی ہے جیسے درندہ اپنے شکار کو دیکھے...... ایسی ہی سرد

آنکھیں..... اچھا تو یہ کرتوت، یہ بے حیائی...

کوئی ہے.....؟ چابک لاؤ.....اُس کی ملائم، چکنی، سُندر کھال ادھیڑ دی جائے.....کون ہے وہ.....؟ بتاؤ.....؟ ایک خوبصورت بانکا جوان.....اَنگ اَنگ سے جھانکتی مستی.....آنکھوں میں چھلکتا جوانی کا خمار اور اُس خمار میں اس لڑکی کا پیار آبگینوں جیسا شفاف اور نازک۔

لیکن اس لڑکی میں کیا ہے.....؟ (حیرت)

وہ اس لڑکی کو غور سے دیکھتی ہے اور بے دھیانی میں اس سے مقابلہ کرتی ہے۔ ابھی اور کتنا انتظار کرنا ہوگا.....؟ وہ خاموشی اور سناٹے میں اس سوال کے جواب کا انتظار کرتی ہے۔ ایک سسکی سی اُس کے دل میں اُٹھتی ہے اور ہونٹوں پر آتے آتے بجلی کا کوندا بن جاتی ہے۔

''نکالو اس گندی مچھلی کو۔''

دستک.....

بند کرو دستک

اوہ! کون ہو تم؟ اندر کیسے آئے؟

''جی وہ.....'' وہ لڑکی دراصل'' ..... ''پر تم اندر کیسے آئے.......؟''

(کتنا جارحانہ انداز ہے۔ لگتا ہے طوفانی لہر کی طرح سب کچھ بہا کر لے جائے گا)

(وہ کتنی کمزور ہے).......

''چپڑاسی'' .....(گرج)

''جی میڈم''

''دیکھیے وہ لڑکی.....'' (وہ اُسے مسل ڈالے گا۔ کتنا چھا جانے والا وجود) وہ کھڑی ہو کر میز پیٹتی ہے.....

''چپڑاسی'' .....

بدحواسی میں وہ کال بیل بجانا بھول جاتی ہے..... ''چپڑاسی..... اس بدتمیز کو کس نے اندر آنے کی اجازت دی..... بولو''

''میڈم یہ زبردستی.....''

''زبردستی'' ..... وہ گم ہو جاتی ہے اور آگے کچھ نہیں سنتی۔ اخبار کی سُرخیاں اُس کے

ذہن میں ہیں۔

''زبردستی''......وہ ہوش میں آ کر چلاتی ہے۔ وہ سخت غصے میں ہے مگر اُس کی آواز میں لرزش ہے۔

''زبردستی''...... یہ لفظ گویا اُس کے ذہن کے پردے پر چپک گیا ہے۔ وہ خوف زدہ ہے۔ وہ کتنے جارحانہ انداز میں کھڑا ہے۔ وہ اُسے کچل ڈالے گا......وہ چلاتی ہے۔

''کوئی ہے جو اُسے نکالے''......

''میڈم میری بات تو سنیں''......وہ نرمی سے کہتا ہے۔

لیکن اُس کا چہرہ طناب کی طرح تنا ہوا ہے۔

''گیٹ آوٹ...آئی سے گٹ آوٹ''......وہ غصے سے بولتی ہے مگر اُس کی آواز کسی تک نہیں پہنچتی۔

''جاؤ چلے جاؤ......''

کوئی ہے جو حبشی غلاموں کو بہت سی نیند نہ لانے والی گولیاں کھلا دے۔ اُس کی آنکھوں سے نفرت بہہ رہی ہے۔ اُس کے وجود سے غصہ پھوٹ رہا ہے۔ دنیا کی ہر خوبصورت عورت کو کیل دو اور اب یہاں ان محفوظ اونچی پتھریلی دیواروں کے اندر کوئی نہیں آئے گا...... کوئی نہیں......چلے جاؤ......ہماری نفرت اٹل ہے...سب کے لیے۔

نہیں......ایسا مت کہو......

ہمارے دم گھٹتے ہیں۔ ان دروازوں کو کھول۔ دو ہمیں روشنی چاہیے...ہمیں جانے دو۔ (گھٹی گھٹی سسکیاں)......ہم پر رحم کرو......ہمیں معاف کر دو...ہمیں زمین چاہیے۔ ہمیں دیواروں میں مت چنو......رحم کرو......

تم زندہ کب ہو......تم ممیوں کی طرح ان دیواروں میں بالکل محفوظ ہو۔

ہم پر رحم کرو...ہمیں روشنی چاہیے......ہمیں جانے دو......(سسکیاں)

(بغاوت)

ایک کے بعد دوسرا ہاتھی...... کیا سب کو باہر پھینکنا ہو گا......اور وہ اکیلی...... بالکل اکیلی۔

میں نے اُسے بتایا کہ تم کتنی Sacrificing ہو.....تمہارے اندر قربانی کا کتنا جذبہ ہے۔ وہ بہت متاثر ہوا۔ اُس نے کہا وہ تم سے شادی کرے گا۔

کتنی عمر ہو گی تمہاری؟

وہ خیرات قبول نہیں کرے گی

وہ پاؤں پر پاؤں دھرے بیٹھی ہے.....

کس کی عمر.....؟ (خاموشی)

کوئی ہے جو گھڑ سوار خوب رو شہزادوں کو آواز دے...کوئی ہے.....؟ نہیں....نہیں..... نہیں۔ اُس کی اپنی آواز بے جان گنبد بار بار لوٹا دیتا ہے۔

وہ آئینے کے اندھے غار میں جھانکتی ہے......

اُس کا ایک پاؤں مسلسل ہل رہا ہے۔ اور انگریزی ناول اُس کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اُس کا دل بھرا ہوا ہے۔ وہ رونا چاہتی ہے۔

جواب دو.....ابا جی سے پوچھو.....وہ اپنے تبلیغی مشن سے واپس آنے والے ہیں۔

وہ نفرت کا ایک پھندا تیار کر رہی ہے۔ اُس کا پاؤں مسلسل ہل رہا ہے......

ابا جی اپنے تبلیغی مشن سے واپس آ گئے ہیں۔ وہ اپنی ڈھلکی گردن سے بوسیدہ ٹائی کا چیتھڑا کھینچ کر اُتار رہے ہیں اور اُن کی آنکھوں میں قہر اور غضب ہے۔

''میری محفوظ کشتیو! میں آ گیا ہوں...

''یہ بادبان کیوں پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ کوئی ہے جو لنگر ڈال دے اور طوفان ٹل جائے۔''

لیکن ابا جی گہرے پانیوں پر تو برف جم گئی ہے اور بادبان تار تار ہیں۔ آپ اپنے اگلے تبلیغی مشن پر جا سکتے ہیں۔

وہ اندر ہی اندر خود کو نوچ رہی ہے۔ وہ ان سب کو جو بغاوت کا سوچ رہے ہیں پتھر کا بنا دے گی۔

وہ ہونٹ کاٹ رہی ہے۔

ابا جی کھڑکی میں کھڑے ہو کر اگلی تقریر کا مواد نہ سوچئے۔ سامنے مسز دارا کا کچن ہے

اور ابھی آپ کو تبلیغی مشن پر بھی جانا ہے...... اور میری سادہ لوح ماں آپ کے لیے بغیر نمک مرچ کا سالن تیار کر رہی ہے۔

اس عورت نے کہا تم کتنے کمزور ہو اور وہ کمزور بن گیا۔

(تمہیں تو کھڑکی سے کود جانا چاہیئے تھا)

اور وہ ابا جی سے لپٹ کر خوب رویا۔

اُس کا ایک پاؤں مسلسل ہل رہا ہے۔

بزدل، دبو...... تمہیں چابک بھی پکڑنا نہیں آتی...... خوبصورت چہرے کتنے بھیانک ہوتے ہیں...... انہیں کوئی باگ نہیں ڈال سکتا...... یہ کیل دیتے ہیں...... مَسل دیتے ہیں۔

اور اس کے ہاتھ پھندا لیے خلا میں معلق ہیں اور پاؤں گنبد کی مدور سطح پر چل رہے ہیں۔ جیسے کوئی موت کے کنوئیں میں چلے۔

ایک اعتماد ایک یقین کے ساتھ انہوں نے گنبد کے گرد ایک اور دیوار کھڑی کی تھی۔ اب باہر کی آوازوں سے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ دیوار کے پیچھے ایک اور دیوار۔ محفوظ کشتیاں ریت میں دھنس گئی تھیں...... اور بادبانوں کی گردنیں ٹوٹ چکی تھیں۔ اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لیکن پھر کیا کوئی پرت کمزور رہ گئی تھی جو باہر کا شور سنائی دینے لگا تھا۔ اندر کی خاموشی میں باہر کا شور کس قدر بے ہنگم لگتا تھا۔

خطرے کا الارم بج رہا ہے اور اُس کے ذہن کے کسی دور افتادہ کونے میں کھل جا سم سم کا لفظ گم ہے۔

اُن کے چہرے زرد ہیں اور اُن کی گدلی آنکھیں پتھریلی دیواروں پر ٹکی ہیں۔ اور دیواروں میں کوئی سوراخ نہیں ہے...... اور دروازوں میں ماسٹر لاک پڑے ہیں۔ اندھے کنوئیں میں سے آواز آتی ہے۔ ان کے لب ہلتے ہیں...... سماں دھندلا اور جھٹ پٹے کا سا ہے۔

کوئی ہے...... ہے ہے...... ہے......

آواز پلٹتی ہے۔ دھیان بے دھیانی میں فضا میں معلق پاؤں سُن ہو جاتے ہیں۔ سر ہلتے ہیں اور بال چہرے پر جھول جاتے ہیں... خشک بے رنگ بال......

ضرور کوئی ہے......کس نے دستک دی......(حسرت)

کوئی نہیں......کوئی نہیں......(حسرت)

جب انسان زندگی کے میدان میں پست ہو جاتا ہے، جب وہ جان جاتا ہے کہ وہ اپنی باری لے چکا ہے تو وہ پیچھے ہٹتا ہے۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے وہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ اپنا دفاع نہیں کرسکتا۔ صرف اپنی بے بسی کا تماشا دیکھتا ہے۔ تب اچانک زندگی کے تمام اسرار و رموز اُس پر بے نقاب ہو جاتے ہیں اور وہ ایک نعرہ مستانہ لگاتا ہے......

پالیا.... میں نے پالیا......

مگر اُس کی یہ فاتحانہ چیخ اُس کے پپڑی جمے ہونٹوں اور خشک گلے کے درمیان گھٹ کر رہ جاتی ہے اور کسی کو سنائی نہیں دیتی..... جیسے نزع کے عالم میں کوئی شخص موت کو اپنے روبرو مجسم پائے اور اُس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹ جائیں مگر زبان گنگ رہ جائے۔ تب باخبر اور بے خبر کے درمیان یہ لمحہ بڑا الم ناک اور کرب ناک ہوتا ہے۔ باخبر گنگ ہے اور بے بسی سے دیکھتا ہے۔ بے خبر کے پاؤں موت کے کنوئیں کی مدوّر سطح پر نیچے کی طرف چلتے ہیں...... کوئی کچھ نہیں دیکھتا۔ خلا میں گنبد کی لوٹائی آوازوں کا ہجوم ہے...... مگر کوئی کچھ نہیں سنتا۔

دروازے میں پڑا ماسٹر لاک اور لاشعور کے کسی نہاں خانے میں جانے کا خیال...... مگر بے کسی، بے بسی...

نیچے گلی میں چوکیدار کی ٹھٹھری آواز، انگیٹھی میں سرخ دہکتے کوئلے، خوف اور ایک دوسرے کے قریب آنے کی بھوکی خواہش... ان پولیسٹر کی رضائیوں میں کس قدر ٹھنڈک اور سرد مہری ہے۔

ہیٹر کی گرمی بھی بے مہر ہے اور جب آسمان پر بادلوں کے دھند لکے چھا جاتے ہیں تو سردی کی راتیں کس قدر بے رونق، سنسان اور اُداس ہو جاتی ہیں... ہر چیز ٹھنڈی، بے مہر... قبر کی تہہ کی طرح۔

انتظار کے بعد کتنی خاموشی، دکھ اور تنہائی رہ جاتی ہے۔ ہر شے پر بیتے برسوں کی کالک جم جاتی ہے۔

ان کے سر دیوار پر ٹِکے ہیں اور دیوار سے آگے ایک اور دیوار اور اُس سے آگے ایک اور دیوار اور وہ پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں اور گنبد کی مدوّر گہرائیوں سے اب کوئی آواز نہیں آتی........ان کے سفید بال چہروں پر جھول گئے ہیں، آنکھوں میں گہرے تاریک خلا ہیں، زبان گنگ اور ہاتھ مفلوج ہیں...

اب ساری دیواروں کو گرادو، ماسٹر لاک کھول دو اور حبشی غلاموں کو چھٹی دے دو۔

دلِ ناداں

وہ حیران کی حیران رہ گئی۔ وہ منہ اُٹھائے اُسے دیکھ رہی تھی۔ سلمہ بھی دانت سے تاگا توڑتے توڑتے وہاں آ پہنچی تھی، اور اُسے دیکھ کر سلمہ کو بھی گویا سناٹا نگل گیا۔

یوں منہ اُٹھا کر دیکھتے ہوئے ماں کو چکر سا آ گیا اور وہ گھمن گھیری کھا کر زمین پر جا پڑی۔ سلمہ نے بھی بمشکل اپنی نظریں جھکائیں اور ماں کے لیے کٹورے میں پانی لینے بھاگی۔

ماں نے سر پر ہاتھ مارا:

''ارے میری قسمت پھوٹی یہ کیا ہے؟''

سلمہ نے دونوں ہاتھوں سے ماں اور پانی کے کٹورے کو سنبھالتے ہوئے کہا:

''ہاں ماں میرا دل ابھی تک دھک دھک کر رہا ہے، یہ کیسی انہونی ہے۔''

وہ پاس ہی شرمندہ سا کھڑا تھا، بولا:

''تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں اور کر بھی کیا سکتا تھا؟''

''ہاں ماں ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔''

سلمہ اُس کے اُلجھے اُلجھے ملول چہرے کو دیکھ کر اندر سے ٹوٹ سی گئی۔

''ہائے میرا بھیا! آخر وہ بھی کیا جانتا تھا''

''ہاں ماں بالکل بھی نہیں۔'' وہ منمنایا۔ ماں دور دیکھتے ہوئے بولی:

''میں نے بھی کتنا کچھ سوچ لیا تھا۔ پر یہ نہ سوچا۔ سوچتی بھی کیسے؟ پہلے کبھی ایسا دیکھا نہ سنا... نا بابا ساری حیاتی نہیں۔'' ماں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ اور جوں توں کرتی ایک ہاتھ سے کندھا دباتی اُٹھی۔ اُس کے کندھوں میں مستقل درد رہتا تھا۔ کوئی دبانے والا بھی نہیں تھا۔

کبھی سلمہ کہتی:

''لا ماں دبا دوں۔'' مگر وہ منع کر دیتی۔

سلمہ کے کندھے خود روگی تھے۔ مشین پر جھک کر دن رات کام کرنے سے اس کے کندھوں میں ہر وقت کوئی برچھی سی مارتا رہتا۔

دن رات میں وہ دو سوٹ نکال دیتی۔ فی سوٹ ساٹھ روپے کے حساب سے اُسے مہینے بھر میں کم وبیش تین ہزار روپے مل جاتے۔

ماں آٹھ دس گھروں میں استری کا کام کرتی تھی۔ فی گھر دو سو روپے۔ یوں تقریباً دو ہزار بنا لیتی۔ اس طرح گزر بسر اچھی ہو رہی تھی لیکن کندھے کی بیماری دونوں کو لگ گئی تھی۔ یہ بیماری انہیں کسی پل چین نہ لینے دیتی۔ رات کو سوتے میں بھی ہائے ہائے کرتیں۔ دونوں ہی بے آرامی کی نیند سوتیں۔

ماں کی نظریں ہاشو پر لگی تھیں۔ وہ کچھ بن جاتا تو سارے دلدر دور ہو جاتے۔ کچھ آرام ہی نصیب ہوتا۔

وہ جب کالی سیاہی میں لتھڑے ہاتھوں میں تختی پکڑے گھر لوٹتا تو ماں اُسے بڑی گہری نظروں سے دیکھتی اور اُس کے قد کاٹھ کا اندازہ لگاتی اور سوچتی:

کب اس کی پڑھائی ختم ہوگی۔ کب یہ بڑا ہوگا...

وہ بڑا ہو گیا۔ قد بھی بڑھ گیا مگر پڑھائی اس کے قابو میں نہ آ سکی۔ بس ہندسوں اور لفظوں کی شناخت میں ہی اس کی تعلیم مکمل ہو گئی۔

جب اُس نے سکول چھوڑا تو ماں کو زیادہ فکر یہ تھی کہ وہ اپنا نام بھی لکھ سکے گا یا نہیں؟ اُس نے کئی بار ہاشو سے بڑی فکر مندی سے پوچھا اور ہر بار ہاشو نے ڈِھل مِل لہجے میں کہا:

''ہاں ماں لکھ لیتا ہوں۔''

ماں کا یقین بھی بس کچا پکا سا رہا۔

ماں نے ہاشو کے لیے بڑی دوڑ دھوپ کی۔ کئی ایک سے منت ترلا ڈالا کہ کوئی نوکری لوا دے۔ وہ بڑے اعتماد سے کہتی:

''میرا ہاشو پڑھا لکھا ہے۔ وہ اپنا نام لکھنا بھی جانتا ہے۔''

یہ بھی مگر اتفاق ہی تھا کہ اُسے کوئی ملازمت نہ مل سکی۔

چوڑے بازار میں ان کے گھر کی ڈیوڑھی کے ساتھ ہی سبزی ترکاری کا کھوکھا تھا۔ اندر سیلن زدہ نیم تاریک کمرے میں سلمہ مشین چلاتی۔ سبزیوں کی ملی جلی ہمک ہمہ وقت اُس کے گرد گھومتی اور مسلسل اس ہمک کے ہالے میں رہتے رہتے اُسے سبزی ترکاری کی خوشبوؤں میں فرق کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ شلجم پکتے تو وہ کہتی:

''ماں مولی پکا رہی ہو۔'' گوبھی پکتی تو اس کے منہ میں پانی بھر آتا:

''اچھا ہے ماں آج تو نے میٹھی آلو پکائے ہیں۔'' ماں یہ سب سن کر اُلجھتی:

''سلمہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیا اُلٹی سیدھی باتیں کرنے لگی ہے؟''

''لگتا ہے ناک کی حِسیں جاتی رہی ہیں۔ کیوں، ہے نا ماں؟'' اور وہ زور زور سے اپنی ناک مسلتی۔

ہاشو سبزی کے کھوکھے پر بیٹھتا اور مالک کا ہاتھ بٹاتا۔ شام کو دکان بند کرتے وقت دکاندار اُسے پانچ کا ایک نوٹ اور چند ملی جلی سبزیاں دے دیتا... دو چار شلجم، ایک مولی، ایک ٹماٹر، پیاز کی گٹھی، ایک بینگن یا کدو، آلو، سبز مرچیں اور دھنیا... بس اسی قسم کی سبزی۔

ماں دیر تک ان سبزیوں کو، جو خراب ہونے کے قریب ہوتیں، ٹٹولتی اور اندازہ لگاتی کہ کون سی سبزی کسی دوسری سبزی کے ساتھ ملا کر پکائی جا سکتی ہے۔ پھر افسوس میں سر ہلاتی اور آہ بھرتی۔ پھر ''اللہ تیرا شکر ہے'' زیرِ لب کہتی۔

سلمہ کی ایک ٹانگ سوکھی ہوئی تھی لیکن وہ جھک کر ایک ہاتھ گھٹنے پر رکھ کر چل پھر لیتی۔

ماں اُس کی شادی کے بارے میں بالکل مایوس تھی مگر پھر بھی سوچتی ضرور تھی:

''اس ٹانگ کے ساتھ اسے کون قبول کرے گا؟''

اس دوران صرف ایک رشتہ سلمہ کے لیے آیا تھا۔ لڑکا بڑی عمر کا تھا اور اُس کی کمر پر چھوٹا سا کوہان تھا۔ البتہ چار پیسے کمانے والا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ سلمہ کو خوش رکھے گا۔ لیکن وہ اس رشتے پر خوش نہیں تھی بلکہ اندر سے دکھی تھی۔ اسی لیے اُس نے ابھی بات آگے نہیں بڑھائی تھی۔ وہ اکثر سلمہ کو دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھرتی۔

ہاشو تو ابھی بچہ تھا مگر سلمہ کو ماں کی سوچوں کا علم تھا۔ وہ جانتی تھی ماں کیا سوچتی ہے،

کن فکروں میں رہتی ہے۔ مگر دونوں اس مسئلے کو جذباتی گنجلک بنانے سے کتراتیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر راضی بہ رضا تھیں۔ البتہ ہاشو کے لیے دونوں پریشان تھیں۔ ہاشو اب جوان تھا مگر ابھی تک بے کار اور نکما بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جب ماں سے پیسے طلب کرتا تو سلمہ کو یہ سب اچھا نہ لگتا۔ وہ ایسے وقت میں ماں کو ضرور ٹوکتی اور یاد دلاتی کہ گھر میں کس کس چیز کی ضرورت پڑنے والی ہے: آٹا، نمک، مرچ، چاول... کوئی بل یا کرایہ وغیرہ۔ دوپٹے کے پلو سے پیسے نکالتے ماں ہمیشہ یہ سب سن کر تھوڑا ٹھٹھک جاتی اور ہاشو گھوم کر اُسے التجا بھری نظروں سے دیکھتا۔

''دے دو، دے دو۔'' وہ پھر بولتی، ''جوتی اچھالنی ہوگی اسے۔''

''نہیں ماں۔'' ہاشو منمناتا۔

ماں ذرا رکتے رکتے اُسے پیسے دے دیتی۔

''شام کو لوٹا دوں گا۔'' پیسے لے کر ہاشو قدرے اکڑفوں سے کہتا۔

''دے دے گا۔'' ماں ذرا لجاجت سے کہتی۔

''ماں تم اسے بگاڑ رہی ہو۔'' سلمہ چڑ جاتی۔

''نہیں بگڑتا۔'' ماں جواب دیتی۔

''سوچتی ہوں کیوں نہ اس کی شادی کر دوں مگر کوئی اپنی جائی ایسے تو نہیں دے گا۔ کسی کام سے لگ جائے تبھی نا۔''

''ہاں ماں۔'' ترپائی کرتے وہ تھوڑا سا رُک جاتی۔ ہاتھ کی ترپائی کے وہ الگ سے پیسے لیتی تھی۔ کئی شوقین عورتیں ہاتھ کی ترپائی پسند کرتیں۔ ذرا موٹا کپڑا ہوتا تو اس کی اُنگلی چھلنی ہو جاتی۔ ماں نے کئی بار انگشتانہ پہننے کو کہا تھا مگر وہ لاپرواہی کر جاتی۔

اسے بہت سی رقم جمع کرنا تھی۔ وہ کچھ پیسے ضرور پس انداز کرتی۔ کسی وقت بھی کوئی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

سلمہ کو کئی شوق بھی تھے جن کا پورا ہونا مشکل نظر آتا تھا۔ شوق زیادہ مہنگے نہیں تھے۔ پھر بھی اُسے تو بہت مہنگے لگتے۔ مثلاً لپ سٹک، نیل پالش، جالی والی جوتی جس میں گھنگھرو ٹکے ہوں، چھوٹے کرتے والا گلابی لہنگا جو گوٹے سے بھرا ہو، جھنکار مارتی چوریاں اور سب سے

بڑھ کر تو اُسے پاؤں کی جھانجھر پسند تھی۔ مگر وہ اس کے لیے کتنی بے کار تھی۔ اس سوچ سے ہمیشہ اُس کا گلا اور آنکھیں بھر آتیں۔ ماں بھی اس کے لیے کچھ نہ کچھ بچاتی رہتی تھی اور ناپسند ہونے کے باوجود وہ اس رشتے کا ذکر گول مول انداز میں سلمہ سے ضرور کرتی تھی:

''ہے تو کمانے والا۔ پیسہ بھی ہے۔ ماسی جینا کہتی ہے تیری بیٹی کو زیور کپڑا اچھا ڈال دے گا۔'' وہ بنا کسی تمہید کے کہتی۔ وہ یہ بات سلمہ کے کان میں ڈالتی رہتی اور اس کے جواب کا انتظار کرتی مگر سلمہ چپ چاپ سر جھکائے کام کرتی رہتی اور کسی بات کا جواب نہ دیتی، جیسے یہ کوئی فالتو بات ہو۔

سلمہ کو بھی ہاشو کا فکر تھا۔ وہ بھی اُس کی شادی کے بارے میں سوچتی۔ اُسے ہاشو کو دولھا بنے دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ ہاتھ میں ''گانا'' اور سر پر پگڑ بڑا سا، پاؤں میں سنہری سلیم شاہی جوتا، سفید ٹسری جوڑا۔ تصور میں ہاشو کو یہ سب پہنے دیکھ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی، پھر زور دے کر ماں سے کہتی:

''ماں اس کے لیے کوئی کام ڈھونڈو نا۔ یوں کب تک چلے گا؟''

ماں بھاگ دوڑ کر رہی تھی۔ سب جاننے والوں سے کہہ سن رکھا تھا۔ مگر ہاشو کے پاس کوئی ہنر نہیں تھا اس لیے بات بن نہیں رہی تھی۔ ہاشو بھی فکر مند تھا:

''اماں، کوئی سبزی کا کھوکھا ہی مل جائے۔ مجھے بس یہی کام آتا ہے۔''

''ہاں!'' سلمہ کہتی، ''تا کہ شام تک تمہارے یار بیلی ساری سبزی اُجاڑ کر رکھ دیں۔ تم کہاں کسی کو منع کرنے والے ہو۔''

''میرا کوئی یار بیلی نہیں ہے۔'' ہاشو جواب دیتا۔

''اچھا تو یار دوست بننے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ جہاں شہد ہو گا وہاں مکھیاں تو پہنچیں گی۔ ذرا دوکان کھلنے دو پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔'' ماں چھلنی میں چاول انڈیلتے ہوئے کہتی۔

گرم گرم بھاپ ہاشو کے چہرے پر پڑتی تو اُسے بہت اچھا لگتا۔

سردی بھی زوروں کی پڑ رہی تھی اور اس کے پاس تو صرف ایک ہی گھسا پٹا سویٹر تھا جس میں سو چھید بھی تھے۔ وہ اس کے اندر ہاتھ چھپائے رکھتا مگر صبح صبح ریڑھے سے سبزی اُتار کر ایک بڑے ٹب میں پانی بھر کر اُسے سبزی کو دھونا پڑتا جس کی وجہ سے اُس کے ہاتھ یخ

ہو جاتے اور وہ پورے وجود کے ساتھ کانپنے لگتا۔ اس کی چپل اور کپڑے بھی بھیگ جاتے۔

سبزیوں کو چھابوں میں ترتیب سے رکھتے رکھتے دھوپ کا باریک سا کنارہ دکھائی دینے لگتا جو مشکل سے اُس کے ماتھے تک پہنچتی، پھر بھی وہ ہاتھ سکیڑے اس موہوم سی دھوپ میں کھڑا ہو جاتا۔ تبھی گاہک آنے شروع ہو جاتے۔

وہ ہمیشہ سوچتا کوئی اور کام کر لے۔ اتنی بڑی دنیا میں، جو چھوٹا ہونے کی وجہ سے اُسے کچھ اور بھی بڑی لگتی تھی، کیا اس کے لیے کوئی کام، کوئی جگہ نہیں تھی؟ کام تو ہزاروں قسم کے تھے۔ وہ بغور دیکھتا رہتا۔ ہر کوئی کسی نہ کسی کام میں مصروف تھا... مزدور سر پر پونا رکھے، اوپر تلے بہت سی اینٹوں کو سر پر جمائے، دوسری تیسری منزل پر آتا جاتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ ہانپ جاتا تھا۔ یہ مشکل کام تو وہ پوری زندگی نہیں کر سکتا تھا۔ ماں نے تو اُسے کبھی کٹورا تک نہیں اُٹھانے دیا تھا۔ ماں سارے کام خود ہی نبٹا دیتی۔ تو پھر اس کے مقدر میں کیا کرنا لکھا تھا؟

کچھ لوگ لاری اڈوں پر پانی پلانے کا سہل سا کام کرتے تھے۔ ثواب بھی کماتے تھے اور ایک گلاس کا ایک روپیہ بھی وصول کرتے تھے۔ اس کام کو شروع کرنے میں زیادہ خرچہ بھی نہیں تھا۔ بس ایک بالٹی، ایک جگ، ایک ڈونگا اور ایک گلاس کی ضرورت تھی اور کام شروع۔ پھر پیسے ہی پیسے کمانا تھے۔ اُس نے شیخ چلی کی طرح بہت بڑا سپنا دیکھ لیا۔

ماں نے اُسے یہ سامان مہیا کر دیا اور وہ ایک اڈے پر جا کھڑا ہوا۔ یہ کام بظاہر سہل اور بے خطر تھا مگر تھا تو کام اور ہر کام میں تھوڑی بہت ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہاشو میں کسی قسم کی کوئی ہوشیاری بالکل نہیں تھی۔ وہ پانی پلاتا رہ جاتا اور اکثر سواریاں بنا کچھ دیے چلتا بنتیں۔ اکثر لوگ دو گلاس پی جاتے۔ ڈرائیور اور کنڈکٹر بھی چکمہ دے جاتے۔ اڈے پر ایک اور آدمی بھی پانی پلاتا تھا جو کام میں ہوشیار اور تجربہ کار تھا۔ وہ اُسے دھکیل کر سواریوں کو پانی پلاتا اور پیسے وصول کرتا۔ یوں اس کا پانی بالٹی میں پڑے پڑے گرم ہو جاتا اور اسے دوبارہ برف ڈالنی پڑتی۔ مہینے کے بعد جب حساب کیا گیا تو بمشکل لگائی ہوئی رقم ہی نکل سکی اور ہاشو کا یہ خیال، کہ پیسے ٹوٹ ٹوٹ کر گریں گے، خام ثابت ہوا۔ ماں نے کہا:

''نا بابا! یہ تو مندے کا کام ہے۔ پھر اس میں چلتر کی ضرورت ہے جو تم میں نہیں۔ کوئی

اور کام دیکھو۔''

''آپ نے ہی اسے ایسا بنا دیا ہے۔ کوئی ایک کام بھی تو کرنے نہیں دیتیں۔ نوالہ تک توڑ کر کھلاتی ہیں اسے۔ بھلا میں دیکھتی نہیں۔'' سلمہ دونوں کے بیچ میں آ گئی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ پر اب یہ بڑا ہو گیا ہے۔ لوگ گھر سے نہیں باہر سے چل پھر کر عقل سیکھتے ہیں۔ یہ تو نرا گدھا ہے۔ آخر اس بندے کو بھگایا کیوں نہیں... وہ تم سے بعد میں آیا تھا۔'' ماں نے کہا۔ ''مجھے کسی نے مارنا پیٹنا سکھایا ہی نہیں۔''

''لو اور سنو۔ اب یہ اسے کون سکھاتا؟'' ماں نے کہا اور سلمہ بولی:

''چلو ماں چھوڑو۔ یہ کام بھی کوئی کام تھا۔ بالکل فضول! میں کہتی ہوں میرے پاس بیٹھ کر سلائی کیوں نہیں سیکھتا۔ درزی کی دکان ہی کھول لے۔''

''ہاں۔'' ماں بولی۔ ''وہ بھکر والا بھی تو درزی ہی ہے۔ خوب کما رہا ہے۔ ماسی جینا کہتی ہے...'' ماں بھکر والے کا ذکر کیے بنا نہ رہتی۔

''نا...نا... میں یہ کام بالکل نہیں کروں گا۔'' ہاشو نے کہا۔

''کیوں بھلا؟ اس میں کیا خرابی ہے؟ اچھا چلو خود بتاؤ کیا کرو گے؟'' سلمہ نے پھرکی پر تاگا چڑھاتے ہوئے کہا۔

ہاشو اچانک بولا:

''ماں ایک اور کام مجھے سوجھا ہے۔ کچھ لوگ نئے پرانے سکوں کا کام بھی کرتے ہیں۔''

''اس کا کیا فائدہ؟'' ماں حیران ہو کر بولی۔

''یہ مجھے بھی معلوم نہیں۔ پر اس میں ضرور کوئی فائدہ ہو گا۔ اگر مجھے تھوڑے پیسے دے دو تو میں یہی کام شروع کر دوں۔''

''اس میں بھی پیسے لگیں گے؟ ضرور کوئی ہیر پھیر والی بات ہو گی۔'' ماں نے پریشانی سے جواب دیا۔

''ہو گی تو ضرور۔'' ہاشو بھی سوچ میں پڑ گیا۔

''اور یہ ہیر پھیر والی بات تیری سمجھ میں کبھی نہیں آئے گی۔ خواہ مخواہ رقم ڈوب جائے گی۔ نا بابا یہ کاروبار ٹھیک نہیں ہے۔ نقصان ہی نقصان نظر آتا ہے۔'' ماں نے جواب دیا۔

ہاشو بولا:

''دس بیس روپوں کے سکوں کا کیا نقصان ہو جائے گا؟''

''تم کام کی اونچ نیچ کو نہیں جانتے۔ سچ پوچھو تو میں بھی نہیں جانتی۔''

ماں کو نہ ماننا تھا نہ وہ مانی۔ وہ تو دس بیس روپوں کو بھی تین گرہیں دے کر رکھتی تھی۔ ویسے بھی مہنگائی کا زمانہ تھا اور ضرورتیں کمائی سے زیادہ تھیں۔ اس لیے سوچ سمجھ کر خرچ کرنا پڑتا تھا۔

ہاشو کا قد ماں سے اونچا نکل گیا تھا مگر ماں ابھی تک اُسے بچہ ہی سمجھتی تھی اور کوئی فیصلہ اُسے از خود کرنے نہیں دیتی تھی۔ ہاشو ماں کے اس روّیے کا شاکی تھا۔ وہ خود بھی کچھ کمانا چاہتا تھا۔ اب اُسے ماں سے پیسے مانگتے شرم آنے لگی تھی مگر ماں نہ اسے سبزی لگانے دیتی تھی نہ سِکّوں کا خطرہ مول لینے کو تیار تھی۔''

ہاشو کا ایک دوست موٹر مکینک تھا۔ وہ اسے اکثر اُکساتا کہ وہ اس کام میں آ جائے۔ باہر جانے کا بھی امکان تھا۔ بڑی بات یہ کہ اس کام میں دستخطوں کی بھی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ہاشو کو یہ کام بالکل پسند نہیں تھا۔

اس کا یہ دوست ہر وقت کالا بھبھوت بنا رہتا۔ اکثر گاڑیوں کے نیچے چت لیٹا ہوتا۔ کبھی منہ سے پٹرول کھینچ کر تھوک رہا ہوتا۔ یہ سارے کام اُسے بڑے خطرناک نظر آتے تھے۔

اُس کا ایک دوست لوہار کی دکان پر کام کرتا تھا۔ سرخ دہکتے لوہے پر وہ پوری طاقت کے ساتھ ہتھوڑا چلاتا تھا۔ سرخ دہکتے لوہے میں سے پھلجھڑی کی سی چنگاریاں نکلتیں۔ اس کی آنکھوں پر کالے کھوپوں والی عینک لگی رہتی تھی۔

اُسے یہ بھاری بھر کم سا کام بالکل ناپسند تھا۔ بلکہ یہ دیکھ کر ہی اُسے وحشت سی ہونے لگتی تھی۔ تو پھر آخر وہ کیا کرے؟ کیا وہ یونہی کسی کی دوکان پر یخ بستہ پانی میں سے پانچ روپوں کے عوض سبزیاں نکالتا رہے گا؟

ہاشو کی بڑی خواہش تھی کہ وہ کسی آفس میں کام کرے، اکرم باؤ کی طرح۔

اکرم باؤ ان کے سامنے لمبی ڈیوڑھی والے گھر میں رہتا تھا۔ ویسے تو جب وہ دھوتی کرتہ پہنے بازار میں نکلتا تو ہاشو کو بالکل اچھا نہ لگتا مگر صبح کو جب وہ ڈیوڑھی سے اپنی سائیکل

کھینچ کر نکالتا اور خود خاکی وردی پر سنہرا بلا لگائے باہر نکلتا تو وہ اسے بہت اچھا اور بار لگتا۔ اس وقت وہ اسے خاص طور پر اکرم بابو کہہ کر پکارتا اور سلام کرتا۔ اکرم باؤ گھوم کر اُسے دیکھتا۔ سلام کا جواب سر اور آنکھوں کے ہلکے سے اشارے سے دیتا۔ کبھی کبھی ہونٹ بھی ہلا دیتا۔

اکرم باؤ کے ساتھ اس کی یہ معمولی سی جان پہچان کبھی اس کے کام بھی آ جائے گی، یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

ایک دن اکرم باؤ نے اُسے خاص طور پر آواز دے کر بلایا اور پوچھا:

''بھئی کیا نام ہے تمہارا؟''

''ہاشو جناب... ہاشم۔''

''اچھا اچھا، کچھ لکھنا پڑھنا جانتے ہو؟''

''ہاں جناب، دستخط کر لیتا ہوں۔''

''کافی ہے۔'' اکرم باؤ نے جواب دیا۔

''جس دفتر میں میں کام کرتا ہوں وہاں ایک نوکری ہے۔ کام ذرا ٹیڑھا ہے لیکن تمہارے جیسے قد بُت کے نوجوان کے لیے کوئی مشکل نہیں ہو گی۔ آسانی سے کر لو گے۔ سائیکل چلانا آتی ہے؟''

''جی جناب، بہت اچھی طرح۔''

''بس پھر ٹھیک ہے۔ سائیکل بھی خود دیں گے اور تنخواہ بھی۔ پہلے تھوڑی کم ہو گی مگر پھر بڑھ جائے گی، فکر کی بات نہیں۔''

''مہربانی جناب۔ سلام علیکم جناب۔'' ہاشو نے انکساری سے کہا۔

اُس دن جب وہ گھر آیا تو اس میں پہلے والا ڈھیلا پن نہیں تھا۔ اُس نے آتے ہی کہا:

''لو ماں، میں نوکر ہو گیا۔ صبح جلدی جگا دینا، کام پر جانا ہے۔ وہ اپنے اکرم باؤ ہیں نا، انہی کے ساتھ جانا ہے۔''

''اللہ تیرا شکر ہے! پر بیٹا کام کیا ہو گا؟'' ماں نے جھٹ اس کا ماتھا چوم لیا۔

''کام کا تو ابھی کچھ پتا نہیں۔ جا کر ہی معلوم ہو گا۔ کافی اہم کام معلوم پڑتا ہے۔ وہ

آنے جانے کے لیے سائیکل بھی دے رہے ہیں ساتھ تنخواہ بھی۔''

''سائیکل!!'' ماں بیٹی کام چھوڑ کر اُس کے گرد اکٹھی ہو گئیں۔

''ہاں ہاں...سائیکل۔''

''ارے واہ، پھر تو تمہارے بڑے ٹوہر ہو جائیں گے۔ کس رنگ کی ہو گی؟'' سلمہ نے پوچھا۔

''کالی...اور کیا!'' ماں نے کہا۔

''سبز اور سرخ بھی ہوتی ہے۔ مجھے تو سرخ پسند ہے۔ ہاشو تم وہی لینا۔'' سلمہ نے جوش سے کہا۔

''لو اب وہ اس کی مرضی پوچھیں گے۔ جیسی بھی ہو سائیکل تو ہے نا۔'' ماں نے کہا۔

''ہائے ماں، اسے رکھیں گے کہاں؟'' سلمہ نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

''یہاں ڈیوڑھی میں، اور کہاں؟'' ماں بولی۔

''اور جو کوئی اُٹھا کر لے گیا۔ نا بابا، کمرے ہی میں رکھ لیں گے۔''

''ہاشو تالا لگا دے گا۔'' کیوں ہاشو؟''

''ہاں ماں اور اب آسانی ہی آسانی ہے۔ صبح جاتے جاتے ادھر کالونی میں تجھے چھوڑتا ہوا جایا کروں گا اور اتوار بازار بھی جب جانا ہوا تمہیں لے جایا کروں گا۔ کہاں اتنی دور پیدل جاتی ہو۔ پھر بوجھ اُٹھا کر لاتی ہو۔''

''ہاں، بہت دنوں سے تمہاری ماسی کی طرف نہیں جا سکی۔ بسوں میں دھکے کھانے پڑتے ہیں۔ پھر کرایے اتنے بڑھ گئے ہیں، ہمت نہیں پڑتی۔ اب تو تمہارے ساتھ جانے کی آسانی ہو جائے گی۔''

''بڑا آرام ہو جائے گا ماں، پر مجھے کون بٹھائے گا؟'' سلمہ نے اداسی سے کہا۔

''کیوں نہیں، میں بٹھاؤں گا۔'' ہاشو نے زور دے کر کہا۔

''پر میں جاؤں گی کہاں، میری تو کوئی سہیلی نہیں ہے۔ کوئی ملنے ملانے والی بھی نہیں ہے۔ میرا کوئی نہیں ہے۔ آخر کس کے پاس جاؤں گی؟'' سلمہ کی آنکھیں تر ہو گئیں۔

''میں تمہیں بازار لے جاؤں گا۔ وہاں سے تم جو دل میں آئے خرید لینا۔''

''ہاں سچ۔'' سلمہ اچانک خوش ہوگئی۔

''میں عید پر تمہارے ساتھ جا کر چوڑیاں اور مہندی خریدوں گی۔'' سلمہ ہنسنے لگی مگر ہاشو سلمہ کی آنکھوں میں تیرتے آنسو دیکھ سکتا تھا۔

''بھکر والے کے پاس بھی سائیکل ہے۔'' ماں نے جیسے حوصلہ دینے کو کہا۔

ہاشو سب سنتا رہا پھر سونے چلا گیا۔ وہ اندر سے بہت خوش تھا۔

سلمہ نے آنسو پونچھ ڈالے۔ اب وہ مسرور تھی۔ ماں، بیٹی دونوں آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگیں۔ وہ نئے نئے پروگرام بنا رہی تھیں:

''ماں، تمہیں یاد ہے، چھیمو میرے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ شاید یہیں کہیں رہتی ہو۔ میں اس کے گھر چلی جاؤں گی۔ پر اب نہ جانے وہ کہاں ہو؟''

''یہیں کہیں رہتی ہوگی۔ ہم تلاش کرلیں گے۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' سلمہ نے کہا۔ پھر سوچنے لگی، ماں کو کالونی جانے کی آسانی ہو جائے گی، یہی بہت ہے۔ واپسی پر وہ چل لے گی۔

گھر میں ایک نئی چیز کے اضافے کے خیال سے وہ دونوں جذباتی ہو رہی تھیں۔ وہ نیم تاریک کمرے کی بوسیدہ چیزوں کے درمیان ایک نئی چمکیلی سائیکل کو کھڑا دیکھ رہی تھیں اور حیران ہو رہی تھیں۔ ان کے تو خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ کبھی ہاشو بھی اتنی اہمیت حاصل کر جائے گا اور اچانک گھر کے سربراہ کی سی حیثیت اختیار کر لے گا۔ ماں بہن دونوں نے اُسے ایسا مان لیا تھا۔

ہاشو رات کو جلدی سو گیا۔ اُسے صبح سویرے اُٹھنا تھا۔ لیکن وہ ساری رات بے چین سا رہا۔ رات بھر بس وہ سائیکل کے خواب ہی دیکھتا رہا۔

کبھی دیکھتا ایک بہت گھٹیا اور پرانی سائیکل اُسے ملی ہے۔ کبھی وہ سائیکل لینے کو ہاتھ بڑھاتا اور سائیکل غائب ہو جاتی۔ ایک بار اُس نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ اس خواب میں سائیکل تو نہ تھی مگر اُس نے دیکھا کہ وہ اونچا ہی اونچا ہوتا جا رہا ہے اور نیچے ہر چیز چھوٹی ہوتی جا رہی ہے۔ سارے ہی خواب بے چین کر دینے والے تھے۔ صبح اُٹھا تو ہشاش بشاش ہونے کے بجائے اُس کی طبیعت کسلمندی سی تھی۔ وہ کچھ اداس اور پریشان تھا۔ اُسے شک ہو رہا تھا کہ

شاید یہ نوکری اُس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ معلوم نہیں کتنے لوگ اس نوکری کے لیے وہاں موجود ہوں۔ ظاہر ہے اتنی اچھی نوکری کسے نہیں چاہیے ہوگی۔

نمکین چائے میں کلچہ ڈبو کر کھاتے ہوئے وہ متفکر سا رہا۔ ماں نے ایک دو بار کریدا بھی:

''کیا بات ہے بیٹا، آج تو تمہیں بہت خوش ہونا چاہیے۔ نوکری جو مل رہی ہے اور سائیکل بھی، اللہ کا شکر ادا کرو۔''

''نہیں ماں، ڈرتا ہوں کوئی اور یہ نوکری نہ لے جائے۔''

''ایسی منحوس آواز منہ سے نہ نکال۔'' سلمہ نے اُسے ٹوکا۔ ہاشو چپ ہو گیا۔

وہ صبح تڑکے ہی اکرم باؤ کے گھر کے سامنے جا کھڑا ہوا... کہیں ایسا نہ ہو اکرم باؤ اسے لیے بغیر ہی نکل جائے۔

خاصے انتظار کے بعد اکرم باؤ گھر سے برآمد ہوا۔ اُسے منتظر دیکھ کر مسکرایا:

''آؤ بھئی چلیں۔'' دونوں روانہ ہو گئے... وہ پیچھے کیریئر پر بیٹھ گیا۔

راستے میں باؤ اکرم نے اُسے بتایا کہ وہ اس دفتر میں چپراسی ہے اور یہ کہ اُسے ایک سٹول ملا ہوا ہے۔

''میں سارا دن اسی پر بیٹھا رہتا ہوں۔ جب صاحب گھنٹی بجاتا ہے تو میں کمرے کے اندر چلا جاتا ہوں اور جو کام بھی صاحب بتائے وہ کر دیتا ہوں۔ صبح کمرے کی جھاڑ پونچھ بھی میرے ذمے ہے۔ وہ میں ہی کرتا ہوں۔''

وہ چپ بیٹھا سنتا رہا۔ اس دفتر کے سارے کام اُسے بالکل آسان لگے۔ سائیکل کا لالچ نہ ہوتا تو وہ بھی چپراسی بن جاتا۔ سٹول پر بیٹھتا۔ اُسے تو ہمیشہ سے ایسے ہی سست اور آرام دہ کام اچھے لگتے تھے۔

اکرم باؤ اُسے صاحب کے پاس لے گیا۔ صاحب نے اُس کے اونچے لمبے قد کو غور سے دیکھا۔ لڑکا مناسب تھا۔

''تم اسے اچھی طرح جانتے ہو نا؟'' صاحب نے باؤ اکرم سے پوچھا۔

''جی جناب، ہمارا پڑوسی ہے۔ بہت شریف لڑکا ہے۔ بالکل بھی پرواہ نہ کریں۔

میں اس کا ذمہ دار ہوں۔''

''ویسے تو نقد ضمانت کے بغیر ہم نوکری نہیں دیتے مگر تمہاری شخصی ضمانت پر ہم اسے رکھ لیتے ہیں۔ ہاں بھئی، بتاؤ تمہیں سائیکل چلانا آتی ہے؟ ذرا بڑی سائیکل ہے لیکن اس میں مہارت حاصل کرنا کچھ مشکل کام نہیں ہے... اکرم تمہیں سب کچھ بتا دے گا۔''

''جناب لڑکا ہوشیار ہے۔'' اکرم باؤ نے کہا۔

ہاشو جلدی سے بولا:

''جناب ٹریننگ کی ضرورت نہیں۔ میں خوب چلا لیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ کچھ تم جانتے ہو کچھ ہم سکھا دیں گے!'' صاحب ہلکا سا مسکرایا۔

''جاؤ اکرم اسے بوٹے سے ملوا دو۔''

صاحب بلا وجہ فکر مند ہو رہے ہیں... ہاشو نے دل میں سوچا۔

''اصل میں یہ ایک قسم کی اشتہار بازی ہے۔ اشتہار سمجھتے ہو نا؟''

اکرم باؤ نے کمرے سے نکل کر اُسے بتایا:

''شہر کے مختلف حصوں میں تمہیں اس سائیکل پر گھومنا ہوگا... چند دن کی مہارت اور بس۔''

کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی وہ سر ہلاتا رہا۔ اب وہ اُس جگہ پہنچ گئے تھے جہاں سائیکل اور بوٹا موجود تھے۔

''یہ لو بھئی تمہارا نیا شاگرد۔''

اکرم باؤ نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور ہاشو کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

اُس کے سامنے کوئی بارہ، پندرہ فٹ اونچی گدی کی سائیکل کھڑی تھی... جس پر اُسے بیٹھنا تھا۔

گُھن

جس کسی نے یہ بات سُنی، دانتوں میں انگلی داب لی اور 'گل' کی اتنی تعریفیں ہوئیں کہ بیچاری زبیدہ سچ مچ شش و پنج میں پڑ گئی۔

پھوپھی آمنہ صبح سویرے تانگے میں سوار آ پہنچیں۔ اُن کی ایک آنکھ میں موتیا اُتر آیا تھا، آپریشن ہوا، پٹی اتر گئی تھی مگر ابھی سبز دھجی بندھی ہوئی تھی۔ اوپر کالا چشمہ بھی لگا لیا تھا۔ مگر اپنی تکلیف کو بھول کر دوڑی آئیں۔ زبیدہ نے انہیں دیکھا تو سچ مچ اپنوں کی محبت کا احساس کر کے شرمندہ سی ہو گئی۔

پھوپھی آتے ہی پھٹ پڑی:

''میرا تو سنتے ہی کلیجہ نکل گیا۔ رانوں کی ماں سے بار بار پوچھا، کرید کرید کر پوچھا اور سچ جانو جو ایک بات پر بھی یقین کرنے کو جی چاہا ہو۔ سُنا ہے کالا سیاہ رنگ ہے، اوپر سے چیچک نے گڑھے ڈال رکھے ہیں، ذات پات بھی اپنی نہیں ہے...... ہائے میں پوچھوں، رشتوں کا کیا ایسا ہی کال پڑ گیا ہے جو بیٹی غیروں میں دے رہی ہو۔''

لدھیانے والی خالہ جو جبڑا ٹیڑھا کر کے بکری کی طرح پان چباتی تھیں اور لال سر والی ممانی، جو پڑوس میں رہتی تھیں پھوپھی کا سنتے ہی آن دھمکیں۔

خالہ نے ہاں میں ہاں ملائی:

''میں بھی یہی کہوں، دونوں سمجھدار اور عقلمند ہو کر بیٹی کا نصیبہ پھوڑ رہے ہیں۔''

ممانی نے بات اُچک کر کہا:

''لالچ کس بات کا ہے۔ لڑکی آنکھ ناک سے کانی نہیں، گھر بیٹھے رشتے ملیں گے۔''

زبیدہ جو قہوہ اور الائچیوں والی چائے بناتے بناتے بوکھلا گئی تھی، گھبرا کر بولی:

''ابھی تو بات پیغام سے آگے نہیں بڑھی، جو کچھ کریں گے سب کے صلاح مشورے سے کریں گے۔ ویسے نوکری اچھی ہے۔''

''نوکری کو بھاڑ میں ڈالیں جو دیکھنے میں بھوت ہو۔ ہماری گُل لاکھوں، ہزاروں میں ایک ہے۔ اس کے لیے رشتوں کی کمی نہیں۔''

چھوٹی خالہ جو کئی دنوں سے گھر میں مہمان تھیں، انہوں نے بھی منہ کھولنا اپنا فرض جانا۔

ٹھیک اُس وقت گُل کندھے پر بیگ ڈالے گھر میں داخل ہوئی اور کمرے کی دہلیز پر ٹھٹھک گئی۔ خالہ نے کتنی جلدی اپنے پچھلے فیصلے کو بدل دیا تھا۔ کل اُسے دیکھ کر انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا تھا:

''آپا تُو نے گُل کو گھر میں ڈالے سڑا دیا، بیاہ کی عمر نکل گئی، اب کہاں رشتہ لگے گا۔ دیکھ لینا یہاں سے بھی نہ ہو جائے گی۔''

گُل کمرے میں داخل ہوئی۔ کچھ بادلوں کی وجہ سے اور کچھ گرے ہوئے بھاری پردوں کے سبب کمرہ نیم تاریک ہو رہا تھا۔ اُس نے سوئچ آن کیا تو سامنے الماری میں لگے ہوئے بڑے سے آئینے میں اپنا پھیکا سا ہیولا نظر آیا۔ اُس نے نظریں پھیر لیں اور بیگ میں سے دوہرے کیے ہوئے امتحانی پرچوں کا بنڈل نکال کر میز پر رکھ دیا۔

پچھلے دنوں وہ امتحان لینے قصور گئی تو وہاں اُس کی ملاقات عارفہ سے ہوئی۔ دونوں کو بی۔ اے کیے بارہ سال ہو گئے تھے۔ اب جو ملیں تو بھولی بسری سہیلیوں کے نام لے کر حالات سنانے لگیں اور یہ جان کر اُسے خوشی اور حیرت کے علاوہ مجرمانہ سی تسکین بھی ہوئی کہ اُن میں سے اکثر گھروں میں ہی بیٹھی تھیں۔ بس دو چار تھیں جن کی شادیاں ہوئی تھیں۔ ان میں سے بھی آدھی کو طلاق ہو چکی تھی۔ اُس دن آئینے کے سامنے کھڑے، بال سنوارتے ہوئے اُس نے اپنی عمر میں سے کئی سال گھٹے ہوئے محسوس کیے۔ وہ بلاوجہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ مگر کل خالہ نے پھر اُسے مایوسی کے کیچڑ میں دھکیل دیا تھا۔

بہت نظر انداز کرنے اور بچنے پر بھی مڑتے مڑتے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور ٹھٹھکی خود کو دیکھتی رہ گئی۔ کالے بالوں میں دو چار چاندی کے تار چمکنے لگے تھے، آنکھوں کے

گرد گہرے گہرے سیاہ حلقے تھے، گالوں کے اندر دب جانے سے ناک بے حد پتلی اور لمبی نظر آنے لگی تھی، ہونٹ بے رنگ اور چہرہ پکے شلغموں جیسا پھیکا اور بے رونق تھا۔ اُس نے بڑی آہستگی سے اپنے سوکھے، مرجھائے ہاتھوں کو اوپر اُٹھایا اور انگلی کی پوروں سے رگڑ رگڑ کر گالوں اور ہونٹوں سے سرخی کا رنگ چھڑانے لگی۔ بیگ میں سے کوئی بہت ضروری چیز ڈھونڈتے ہوئے اُس نے سوچا:

''اماں بھی کن جھوٹے وہموں میں پڑی ہیں اور یہ پھوپھیاں، ممانیاں اور خالائیں بھی کان میں ذرا سی بھنک پڑتے ہی برساتی کیڑوں کی مانند اکٹھی ہو جاتی ہیں اور اونچے نیچے سُروں میں اپنا اپنا راگ الاپنے لگتی ہیں۔''

ماں بھی ان کی ہر بات پر زور شور کے ساتھ سر ہلانے کے سوا کچھ نہ جانتی۔ وہ سب اُسے خود غرض، مطلبی اور تماشہ دیکھنے والی نظر آتیں اور وہ اُنہیں سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ کبھی ان کے خلاف کوئی بات کہہ دیتی تو اماں بُرا مان جاتیں اور بگڑ کر کہتیں:

''اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں۔ وہ ہمارے بھلے کی سوچتے ہیں۔ وہ پھینکیں گے بھی تو جگہ دیکھ لیں گے۔''

اور جھنجلا کر اُس کا جی چاہتا کہہ دے:

''ہاں بیچارے بھلے کی سوچتے ہیں! پانچ سال پہلے لدھیانے والی خالہ نے بھی ہمارے ساتھ بھلا کیا تھا نا۔'' مگر ایسا کہنے میں اُسے اپنی سخت توہین محسوس ہوتی تھی اور وہ پاؤں پٹختی، ہونٹ کاٹتی رہ جاتی۔

پانچ سال پہلے اظہر کے پیغام کو کیسے اُچک لیا تھا۔ ہر پھیرے میں وہ اظہر میں اتنے کیڑے ڈالتیں کہ ہاں میں ہاں ملاتے بیچاری ماں کے کندھوں کے اعصاب اکڑ گئے تھے۔ آخر انکار کروا کے ہی چھوڑا، اور پھر اندر ہی اندر ایسا چکر چلایا کہ اپنی بیٹی کا نکاح اُسی سوعیبی اظہر سے پڑھوا دیا اور ہر ایک سے کہتی پھریں:

''جانے باپ کو کیا نظر آ گیا تھا کہ بیٹی کا نصیبہ پھوڑ دیا۔ میں تو سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی پر انہوں نے نہ ماننا تھا نہ مانے۔''

اور ماں نے کیسی سادگی سے دانتوں میں اُنگلی داب کر کہا تھا:

''ہئی ہے! یہ کیا کر بیٹھے تم دونوں!''

شادی کے بعد امتیاز اور اظہر ملنے آئے تو دونوں کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر ماں نے کیسی بے حسی کا مظاہرہ کیا تھا۔ کم از کم وہ تو یہی سمجھی تھی اور جب وہ رخصت ہو گئے تو ماں نے پھر بھی اصل بات کی طرف رخ نہ کیا تھا۔ بس ایک ٹھنڈا سانس بھر کر اتنا کہا:

''اظہر میں تو کچھ بھی نہیں۔ امتیاز اپنے نصیبے کا کھا رہی ہے۔''

ہاں یہ نصیبہ ہی تھا کہ پانچ سال سے امتیاز، اظہر کے گھر میں راج کر رہی تھی اور پانچ سال سے کسی نے پلٹ کر اتنا بھی نہ دیکھا تھا کہ اس گھر میں بھی کوئی لڑکی موجود ہے۔

زبیدہ بڑی بے چینی سے احمد کا انتظار کر رہی تھی۔ کمرے میں مضطربانہ ٹہلتے ٹہلتے وہ باہر نکلی۔ اس نے بغلی کمرے کا دروازہ کھول کر بتی جلائی۔ کمرے میں رکھا ہوا فرنیچر بجلی کی روشنی سے چمکنے لگا اور یہ چمک اُس کے دل کو بھی منور کر گئی۔ اس نے بتی بجھا کر دروازہ بند کر دیا اور اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ ایک طویل انتظار کے بعد آخر اُس کے ارمان پورے ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ اُس کے آنگن میں بھی مسرتوں کی پریاں اُترنے والی تھیں۔ مگر وہ پھر شش و پنج میں پڑ گئی تھی۔ سوچ اور غور کا مسئلہ پھر اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور فیصلہ کن لمحہ پھر اُس کی پہنچ سے باہر ہو گیا تھا۔ وہ مضطرب سی کمرے میں ٹہلنے لگی۔ لڑکے کی عمر بے شک زیادہ تھی۔ اُس کا رنگ بھی سانولا تھا۔ مگر نوکری اچھی تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ لڑکے والوں کی طرف سے نہ کیے جانے کا امکان موجود نہ تھا۔ اسی اطمینان میں تو اس نے جہیز کی تیاری شروع کر دی تھی۔

''ہاں ہوتے ہی لڑکے والے جلدی ڈال دیں گے۔ دیکھنا یہ کام جھٹ پٹ ہو جائے گا'' اُس نے احمد سے کہا تھا۔

اور احمد اس سے زیادہ جلدی کی فکر میں تھا۔ دو دن پہلے پانچ ہزار میں نیا، بہت عمدہ فرنیچر بن کر آیا تھا۔ مگر اب وہ پھر اپنے فیصلے کو تول رہی تھی۔ کہیں سچ مچ وہ غلطی تو نہیں کر رہی۔ کہیں وہ اپنی ہیرے جیسی بیٹی کو اندھے کنوئیں میں تو نہیں پھینک رہی۔ اس کی کامنی سی بیٹی اس بھدیسل سے دلہا کے ساتھ سج بھی جائے گی۔ کیوں نہ انکار کر دیں؟ ممکن ہے اس سے بہتر رشتہ مل جائے۔ ڈھونڈنے اور کوشش کرنے سے کیا نہیں مل جاتا۔ ٹہلتے ٹہلتے اُس نے

مینٹل پیس پر رکھی گُل کی تصویر اُٹھالی۔ کیسا چنچل اور حسین چہرہ تھا... بھرے بھرے گال، چمکتی ہوئی آنکھیں، ماتھے پر دو چار پریشان لٹیں، ہاتھ میں کتابیں... گل کی یہ تصویر کالج کے زمانے کی تھی۔ تصویر دیکھ کر اُسے فیصلہ کرنے میں جیسے آسانی ہوگئی۔ اُس نے تصویر واپس اسی جگہ پر رکھ دی۔

جب احمد آیا تو وہ آخری فیصلہ کر چکی تھی۔

''لیکن لڑکا بُرا نہیں۔'' احمد نے اُس کا نیا فیصلہ سن کر سمجھانے کی کوشش کی۔

''ہاں ہاں بُرا نہیں ایک صرف عمر میں تمہارے برابر ہے اور دیکھنے میں انسان کا بچہ لگتا ہے۔'' زبیدہ نے تلخی سے کہا۔

''عمر کچھ زیادہ ہے اور شکل بھی واجبی ہے مگر نوکری اچھی ہے اور پھر ہم کب تک انتظار کر سکتے ہیں۔'' احمد نے جواب دیا۔

اور زبیدہ کی زبان پل بھر کو گُنگ ہوگئی۔ مگر پھر چمک کر بولی:

''سبھی یہ کہتے ہیں، لڑکی میں کیا کمی ہے۔ ہم کیوں بھوکوں کی طرح باسی ٹکڑے پر دوڑ پڑیں۔''

''مگر پہلا فیصلہ بھی تمہارا تھا اور مجھے اُس میں کوئی نقص نظر نہیں آیا۔'' احمد پہلے فیصلے کو بدلنے پر خود کو تیار نہ پا رہا تھا۔

''ہاں!'' زبیدہ نے بھرائی آواز میں کہا۔

''مگر مجھے گُل کا خیال آتا ہے۔ وہ کیا سوچے گی؟ ہم کوئی بہتر رشتہ بھی ڈھونڈ سکتے ہیں۔''

''تم بیٹی کے بارے میں بڑی جذباتی ہو۔'' احمد نے کہا۔

''اس رشتے کو توڑنا حماقت ہے۔''

''کیوں؟'' زبیدہ نے تلخ ہو کر پوچھا۔

''ہماری بیٹی اتنی گری پڑی نہیں کہ اُسے کوئی دوسرا رشتہ ہی نہ ملے گا۔''

''اور فرنیچر کا کیا بنے گا؟'' احمد نے سر جھکا کر پوچھا۔

''فرنیچر کو چوہے نہیں کھا جاتے۔'' زبیدہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''ہمیں بہت جلد کوئی اچھا رشتہ مل جائے گا۔'' زبیدہ کے لہجے کی مضبوطی دیکھ کر احمد حیران رہ گیا۔

ٹانگوں پر لحاف اور لحاف پر پیر پھیلائے وہ سرخ پنسل سے نمبر لگا رہی تھی۔ نمبر لگانے کے بعد وہ ان کے گرد سرخ دائرہ بنا دیتی اور پھر اگلا سوال دیکھنے لگتی۔ اُس کا سر اور کمر قدرے خمیدہ تھے جب اُس کی ماں نے بھاری پردے کو ذرا سا ہٹا کر اندر جھانکا اور اپنی بیٹی کو دیکھ کر دہلیز میں ہی رُک گئی... جیسے کسی نے جادو کے زور سے اُسے بت بنا دیا ہو۔

وہ اپنی بیٹی کو حیران اور خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی نظریں نئی اور اجنبی تھیں اور وہ ایسی نظروں سے بیٹی کو دیکھ رہی تھی جن نظروں سے اُس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ لگاتار اُس کی طرف دیکھے جا رہی تھی اور اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ گُل کو پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہے۔ وہ بھرے بھرے گالوں والی گُل جسے وہ روز دیکھتی تھی اچانک کہیں غائب ہو گئی تھی اور یہ گُل جو اُس کی جگہ موجود تھی نئی گُل تھی۔ اس گُل کا جسم نڈھال، چہرہ بے رونق اور روح تھکی ہوئی تھی۔ اُس نے کانپتے ہاتھوں سے پردہ چھوڑ دیا اور دبے قدموں واپس پلٹ گئی۔

برابر کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اُس نے خوف سے آنکھیں جھکا لیں۔ اُسے یوں لگا جیسے کمرے میں رکھے ہوئے فرنیچر کو گُھن لگ گیا ہے اور اُس کی چمک اور اس کا خوبصورت رنگ و روغن داستان پارینہ بن گئے ہیں۔ وہ کسی زبردست بھول میں پڑ گئی تھی۔ وہ تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی جیسے ذرا سی تاخیر بھی خوش قسمتی کو بدقسمتی میں بدل سکتی تھی۔ احمد کمرے میں ابھی تک سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھا تھا۔

زبیدہ نے اپنا ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھ دیا اور سر جھکا کر ہولے سے بولی:

''میرا خیال ہے، ہمیں ہاں کر دینی چاہیے۔''

Her stories are primarily about exploitation. Every family, as neatly observed in her fiction, is a microcosm of the society to which it belongs.

(Muhammad Saleem-ur-Rehman... Weekly Friday Times)

Afra Bukhari's art of story writing is fairly sophisticated. It looks at the material from a distance and watches the character in its psychological and social dimensions. The pathos emerges out of a clash between the humanity of woman character and the indifferent social attitudes surrounding her.

(Professor Jilani Kamran...The Daily Nation)

عفراء بخاری کی کہانیوں میں زیادہ شور نہیں۔وہ جذبوں اور نفسیاتی الجھنوں کو بھی ایسے انداز میں بیان کرتی ہیں کہ ان کی قہرمانی کا احساس بھی دِلا دیتی ہیں مگر دھیمی دھیمی اشاریت سے۔

(ڈاکٹر سہیل احمد خان..... از نجات)

دوسری منزل، مفتی بلڈنگ، 17/31 ٹیمپل روڈ، لاہور

فون: 042-7355323 فیکس: 042-7323950

ای میل: sanjhpk@yahoo.com
sanjhpks@gmail.com

برانچ: 46/2 مزنگ روڈ لاہور۔